

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224930

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلة رسائل محمد بن عبد الله

مبادی عمرانیات

تصنيف

رہنے ورم

ترجمہ

ترجمہ
ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب ڈی ایٹ (پیرس)

یروفیسر تاریخ، کُلیہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

۱۳۵۲ م ۱۳۲۲ ف ۱۹۳۳ ع

الحمد لله رب العالمين

مضت مین

مباوی عمرانیات (رینے ورم)

حصہ اول

(صفحات ۱ تا ۲۴)

صفحہ ۱ تا ۵

۱۲ تا ۱۱

۱۴ تا ۱۳

۲۳ تا ۲۲

۲۴ تا ۲۳

پہلا باب عمرانیات سے کیا مراد ہے ؟
دوسرا باب عمرانیات کو فن نہیں کہہ سکتے
تیسرا باب عمرانیات کوئی اختصاصی علم نہیں ہے
چوتھا باب کیا عمرانیات کو معاشرے کی عام تحقیق سے تعبیر کر سکتے ہیں
پانچواں باب عمرانیات اختصاصی علوم اجتماعی کا فلسفہ ہے

حصہ دوم

(صفحات ۲۵ تا ۱۳۶)

صفحہ ۲۵ تا ۳۳

۴۱ تا ۴۰

۵۰ تا ۴۹

۵۹ تا ۵۸

۶۰ تا ۵۹

چھٹا باب معاشرہ اور اجتماعی تعلقات
ساتواں باب حقیقت اجتماعی کے خصائص اساسی
آٹھواں باب معاشرہ کی حقیقی ماہیت
نواں باب معاہدہ عمرانی یا جسم اجتماعی
دسواں باب علم عمرانیات کی تقسیم

صفحہ ۸۲ تا ۸۳	عناصر اجتماعی	گیا حوالا باب
۹۳ تا ۹۴	حیات اجتماعی	بار حوالا باب
۱۰۵ تا ۱۰۶	ارتقاء اجتماعی	تیر حوالا باب
۱۲۰ تا ۱۲۱	عمرانیات کا طریقہ تحقیق	چودھواں باب
۱۳۶ تا ۱۴۱	عمرانیات کے قوانین	پندرہواں باب
حصہ سوم		
(صفحات ۱۳۷ تا ۱۶۷)		
صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۳	عمرانیات کا تعلق علم کائنات اور علم الحیات کے ساتھ	سولہواں باب
۱۴۹ تا ۱۵۰	عمرانیات کا تعلق نفسیات کے ساتھ	سترہواں باب
۱۵۴ تا ۱۵۵	عمرانیات کا دوسرے علوم اجتماعی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟	اٹھارہواں باب
۱۵۹ تا ۱۶۰	عمرانیات اور اجتماعی فنون کا تعلق	انیسواں باب
۱۶۷ تا ۱۶۸	عمرانیات اور فلسفہ کا تعلق	بیسواں باب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حصہ اول

پہلا باب

عمرانیات سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ ہر علم کے پیش نظر کوئی نہ کوئی متعین مقصد ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض حالات میں ایسا ہو کہ کسی خاص علم کی حدود مقرر کرنے میں ہمیں تال ہو، مگر ہر صورت ہم اس مقصد سے واقف ہوتے ہیں جس کی جانب اس علم کی تحقیقی کوشش ہماری رہنمائی کرنا چاہتی ہے۔ دراصل علوم کے نام بجائے خود ان کی تعریف کا حکم رکھتے ہیں اس لئے کہ انھیں قبول عام کا شرف حاصل ہوتا ہے اور ان ناموں سے لوگ وہی مراد لیتے ہیں جو ان علوم کا موضوع ہوتا ہے۔

مگر عمرانیات کا معاملہ اور دوسرے علوم سے ذرا مختلف ہے۔ خود لفظ عمرانیات سے جو تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی نسبت اختلاف ہے۔ اس لفظ کی ایسی ہی تعبیریں کی گئی ہیں جن سے اس کے متضاد معنی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں کو تو اس میں شبہ ہے کہ آیا لفظ عمرانیات اس ساری علمی تحقیق پر حاوی بھی ہو سکتا ہے یا نہیں جو آج اس کے ماتحت خیال کی جاتی ہے۔ ہمیں اس کا پتہ لگانا چاہیے کہ یہ عدم تیش اور شبہات کیونکر پیدا ہوئے

باب

کیا اس باب میں ہم لفظ ”عمرانیات“ کو قصور وار ٹھہرائیں جو نیا بنا رائج کیا گیا؟ اس لفظ کے رواج پانے کی اصلیت یہ ہے کہ پہلے ہل آگست کو نت لے ۱۸۴۲ء میں اپنی کتاب ”فلسفہ ایجاداتی کے اسباق“ کی چوتھی جلد میں اس لفظ کو استعمال کیا۔ اس کتاب میں وہ لفظ ”عمرانیات“ کو اسی معنی میں استعمال کرتا ہے جس معنی میں وہ پہلے ”عمرانی بلدیات“ کی اصطلاح استعمال کیا کرتا تھا۔ کوئٹہ کے زمانہ سے اب تک آٹنا کافی عرصہ گزر چکا ہے کہ اس مدت میں لفظ ”عمرانیات“ کا مفہوم متعین ہو جانا چاہئے تھا۔ بعض کے نزدیک اس کا مفہوم متعین نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ لفظ ہی خود عجیب سا ہے۔ کوئی چالیس سال ہوئے آئے بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ اس لفظ کی بناوٹ دوغلی قسم کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لفظوں کی دوغلی قسم کی بناوٹ ناقص ہو کر گئی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ لفظ ”سوشیا لوجی“ کی اصل لاطینی ہے اور اس کا لاحقہ یونانی زبان کا ہے۔ شروع شروع میں اسی وجہ سے اس لفظ کو ہمیشہ داوین کے درمیان لکھا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی مترو یا غیر زبان کے لفظ کو لکھتے ہیں۔ کثرت استعمال سے آج اس لفظ کے ساتھ اس قسم کا ذلت آمیز سلوک نہیں کیا جاتا اور روزمرہ میں بھی بلا تکلف بولا جاتا ہے۔ اس سے کم از کم آٹنا کو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ چاہے بعض لوگ عمرانیات کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف رکھتے ہوں مگر یہ کہ ”عمرانیات“ کی اصطلاح کو سمجھنے والے قبول کر لیا ہے۔

ہم نے جو ابھی ابھی کہا تھا کہ اب تک عمرانیات کا مفہوم متعین کرنے میں لوگوں کو تامل ہے اس کے دراصل متعدد اسباب ہیں۔ پہلے سبب کی ذمہ داری خود علمائے عمرانیات کی طرف منسوب کرنی چاہئے۔ انھیں لازم تھا کہ شروع ہی میں اس لفظ کے معنی متفقہ طور پر مقرر کر لیتے۔ انھوں نے اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بالکل برعکس ان میں سے ہر کوئی بس یہ چاہتا تھا کہ اپنی ذاتی رائے کو دوسروں سے منوانے بیٹھے ہو کہ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی اور ہر ایک نے یہ کوشش

باب کہ اس کی راہ اپنے پیشروں اور معاصروں دونوں کی راہ سے الگ رہے۔ بہت سوں نے عمرانیات کو بالکل جدید تصور پیش کرنے کا دعویٰ کیا اور اپنی اٹیج سے اس کی نئی تعریف کھڑی۔ چنانچہ اس امر پر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ لوگ جو علم عمرانیات سے ایک حد تک بے بہرہ تھے یا یہ کہ انہوں نے خاص طور پر اس کی تحقیق نہیں کی تھی، وہ سب کے سب یہ حال دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ وہ اس علم کے مختلف نظاموں سے گھبرا اٹھے اور انہیں ان کی بحثوں سے الجھن پیدا ہونے لگی۔ اس کی ساری ذمہ داری ان پر عاید ہوتی ہے جنہوں نے عمرانیات کے جدید نظام پیش کئے۔ اس پریشاں خیالی کے اسباب کی تحقیق کے وقت ہمیں ایک اور عنصر کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کا تعلق عمرانیات سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ ان علوم سے ہے جو اس کے ساتھ قرابت رکھتے ہیں۔ جس زمانہ میں عمرانیات کی اصلاح نئی بنائی گئی تھی اس سے ہمیں پہلے متعدد محقق اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی چھان بین کر چکے تھے۔ معاشیات، اخلاق، قانون، اور سیاست کے علوم وجود میں آچکے تھے۔ چنانچہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شروع شروع میں ان علوم نے عمرانیات کو جس کی حیثیت نووارد دی تھی، اپنی مجلس میں بے جا دخل اندازی کرنے والے سے تعبیر کیا ہو گا۔ اور غالباً اس کے ساتھ عمرانیات نے بھی ان پرانے علوم کو کھلم کھلا برا بھلا کہا ہو گا اور اپنی بے جا حقارت کے اظہار میں کوئی کوتاہی انہیں کی ہوئی چنانچہ اس ضمن میں آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان علوم کے ماہروں اور علمائے عمرانیات میں جو نظری بحثیں ہوئیں ان سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ آپس کی بد مزگیاں بڑھ گئیں مگر مسائل کی پیچیدگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ بجائے اس کے کہ دوسرے علوم کے ماہر عمرانیات کے دائرہ بحث کو محدود کرتے جس کے اندر وہ کردہ اپنی تحقیق کرتی۔ انہوں نے اس کے نفس وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اس بات کے مدعی ہوئے کہ عمرانیات کے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ

باب ۱: اس قسم کا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو اپنی رائے اور خیال میں مبالغہ کو راہ دینے کے لئے تیار ہو۔

ہمارے خیال میں ان علوم اور عمرانیات کے مابین مفاہمت ہونا کوئی دشواریات نہ تھی۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ آگست کو نت کے وقت میں معاشیات، اخلاق، قانون اور فاضل کے علم سیاست کے پیش نظر یہ مقصد نہ تھا کہ وہ عالم اجتماعی کی تحقیق کرے بلکہ وہ تو اس کی رہبری کا دعویدار تھا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے اس وقت تک ان علوم کی حیثیت محض فنون کی تھی۔ علم میں اور فن میں جو فرق ہے۔ اسے دوسری جگہ واضح کیا جائے گا۔ اگر اس وقت ان علوم اور عمرانیات کے درمیان سمجھوتہ ہو جاتا تو اس سے وہ بنیادی غلط فہمی رفع ہو جاتی جو بدستور آج تک چلی آ رہی ہے۔ بہت بعد میں کہیں جا کر اسے بہت عرصہ نہیں ہوا کہ اجتماعی فنون کے مقابلہ میں اجتماعی علوم وجود میں آئے اور یہ سارے علوم دراصل تاریخ اجتماعی کے حصے ہیں جیسے تاریخ معاشی، تاریخ رسوم، جسے علم رسوم کا نام دیا گیا تھا، تاریخ قانون اور تاریخ ادارات سیاسی۔ ان علوم کا عمرانیات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ان کا رشتہ اتنے قریب کا ہے کہ ممکن ہے کہ بعض اوقات قرابت کی وجہ سے انہیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رقابت پیدا ہو اور ہر ایک یہ کوشش کرے کہ دوسروں کو اپنے میں ضم کر لے۔ مگر انما ضرورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس طرح یہ علوم اپنے آپ کو عمرانیات کا قرابت دار خیال کرتے ہیں اسی طرح عمرانیات بھی انہیں اپنوں میں سمجھتی ہے۔ تو اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی آپس کی کوتاہیوں میں کی دبی حیثیت ہے جو خاندانی جھگڑوں کی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ عمرانیات کے مقصد کے متعلق جو شبہات پیدا ہوئے وہ دراصل اسی آپس کی بحث و تمحیص سے پیدا ہوئے۔ حالانکہ اگر اس بحث کو ٹھیک طریقہ پر کیا جاتا تو اصول عمرانیات کو بین طور پر پیش کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔

بہر حال اس میں قصور چاہے علمائے عمرانیات کا ہو، یا قدیم فنون اجتماعی کے ماہروں کا، یا جدید علوم اجتماعی کے حامیوں کا، ہمیں اس کا اعتراف کرنے میں مطلق پس پیش نہیں کہ عمرانیات کا اصلی مفہوم ہنوز محتاج تشریح ہے۔ عمرانیات کے متعلق لوگوں کے دلوں میں جو شبہات ہیں وہ محض اس کے موضوع بحث کی تفصیلات ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس کے بنیادی اصول اس کی تعریف، اور یہاں تک کہ اس کے نفس وجود پر بھی حاوی ہیں۔ بلاشبہ عمرانیات کے لئے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ بہت جلد ان سب غلط فہمیوں کو رفع کرے۔

ایسا کرنا خود اس کے اپنے لئے مفید ہو گا۔ اور اس کے متعلق جو ہر طرف توقعات قدیم کی گئی ہیں انھیں ایک حد تک پورا کرنے سے پیشتر اسے چاہیے کہ وہ ان تمام مسائل کا حل دریافت کرے جن کی نسبت ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، بعضوں نے عمرانیات سے یہ توقع قائم کر رکھی تھی کہ اس کے ذریعہ ہی انسانی معاشرتوں کو نئی زندگی ملے گی، بعضوں کا اعتقاد تھا کہ عمرانیاتی طریقہ تحقیق سے گویا علوم و فلسفہ کی دنیا میں کایا لیٹ ہو جائے گی۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان توقعات کے قائم کرنے میں انتہائی غور بٹا گیا ہے۔ آگے چل کر ہم اس کی اچھی طرح تصریح کریں گے لیکن ساتھ ہی اس کے ہم اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عمرانیات میں اس کی صلاحیت ضرور موجود ہے کہ وہ انسانوں کے اجتماعی اعمال پر اپنا اثر ڈال سکے نیز انسانی علم میں قابل قدر اضافہ پیش کرے۔ بلاشبہ عمرانیات میں آپ کو ایسے مختلف تصورات ملیں گے جن میں آئندہ نشو و نما پانے کی پوری استعداد موجود ہے۔ اگر عمرانیات سے کوئی مفید کام لینا ہے تو ضرور ہے کہ خود اس کے اصلی تصور کا صحت و صفائی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ دراصل ہے کیا، اور اس میں آئندہ کیا ہونے کی قابلیت موجود ہے، ہم اپنی بحث میں اسی نقطہ تحقیق کو اپنے خیالات کا مرکز قرار دیں گے۔

دوسرا باب

عمرانیات کو فن نہیں کہہ سکتے! | عمرانیات کی تحقیق کا مقصد متعین کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے

پہلے ہم ایک غلط فہمی دور کر دیں جو اس کی نسبت عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اچھے خاصے بڑے لکھے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عمرانیات کی تحقیق کا مقصد یہ

ہے کہ اجتماعی اداروں کی اصلاح اور معاشرۃ کی جدید تنظیم کے طریقے دریافت کئے جائیں بہت سارے لوگ سمجھتے ہیں کہ عالم عمرانیات وہی شخص ہو سکتا ہے جو اشتراکیت کے اصول پر عمل کرتا ہو۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو ”عمرانیات“ اور ”معیشت اجتماعی“ مترادف قرار پائیں گے۔

ہمیں اس بات پر بہت افسوس نہیں کرنا چاہئے کہ دراصل شروع میں

یہ غلط فہمی عام بول چال کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس لئے کہ عام بول چال

ہی کی بدولت لفظ عمرانیات ایسا مقبول ہوا کہ اس سے لوگوں کو ایک

طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ آج عام طور پر جو یہ لفظ اس قدر مروج ہو گیا ہے

تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ عمرانیات کو لوگوں نے اس نیک شگون اور بخت کو

پوری سے تعبیر کیا جو اپنے ایک اشارے سے غریب انسانیت کے سارے

دکھوں کو دور کر دے گی۔ اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں کہ آج لفظ عمرانیات

ہر کس و ناکس کی زبان پر نہ ہوتا اگر لوگ اس کو محض ایک قسم کی علمی یا فلسفیانہ

باب

تحقیق سمجھنے۔

اور بایں ہمہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ عمرانیات کے مستند ماہروں نے اس کو ہمیشہ علمی اور فلسفیانہ تحقیق ہی سے تعبیر کیا ہے۔ فرانس کا مشہور مفکر آگست کونت جس نے دراصل اس علم کی بنیاد ڈالی، اپنی کتاب فلسفیانہ اجالی کے اسباق کے دوسرے باب میں اس بات کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے کہ ہمیں علوم اور ان کی علمی صورتوں میں فرق کرنا چاہئے۔ اس نے عمرانیات کو علوم کی صف میں سب سے آگے جگہ دئی ہے۔ اسی کتاب کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلدوں میں اس نے عمرانیات کے تاریخی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر مفصل بحث کی ہے۔ محض اس کتاب کی تکمیل کی خاطر آگست کونت نے اجتماعی تنظیم کے عملی منصوبوں کو کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیا تھا۔

آگست کونت کے بعد جس شخص نے عمرانیات کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے وہ ہربرٹ اسپنسر ہے۔ اس باب میں وہ بھی آگست کونت کا ہم خیال ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کے نزدیک عمرانیات اس علمی تحقیق کا نام ہے جس کے مطابق انسانی معاشرے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہیں اور ان کی فطری نظم و ترتیب عمل میں آتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب ”تشریح عمرانیات“ اور ”اصول عمرانیات“ میں یہی کیا ہے کہ

لے۔ بعد میں پھر جب آگست کونت کو اجتماعی تنظیم کا خیال پیدا ہوا تو اس نے اپنی وہ کتاب لکھی جو دو ناموں سے مشہور ہے نظام سیاست اجالی یا پائض عمرانیات جس میں مذہب انسانیت کے اصول دونوں کے لئے ہیں اس کتاب میں اس نے عمرانیات سیاسیات اور مذہبیتوں کو آپس میں گڈا کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کے مشہور شاگرد امیل لٹرے اور جان اسٹورٹ جی دونوں نے کونت کے ان خیالات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دونوں نے اس سے قطع تعلق کرنے کے بعد اپنی تحقیق دوسرے اصول پر مبنی طہرائی اس لئے کہ کونت نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں معروضی طریقہ تحقیق کے بجائے موضوعی طریقہ سے اپنے نتائج نکالے ہیں۔

یاد

اسی نقطہ نظر سے سب واقعات کا انتخاب کیا ہے، انھیں ترتیب دی ہے اور ان کے فطری اعمال کو عام قوانین کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں عمرانیات کے علمی پہلو کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

بعد میں آنے والے علماء عمرانیات نے ان دونوں کی تقلید کی۔ چنانچہ فرانس میں الفردفوئے، گبریل تارو، الفرد اسپیناس اور ایل درکیم سب ہم خیال ہیں کہ عمرانیات ایک علمی یا فلسفیانہ نوعیت کی تحقیق ہے اسے اعلیٰ زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسی طرح بلجیم میں گیوم دے کرلیف نے، روس میں یوین دے روبرتی نے، آسٹریا میں لڈوگ کیلو وینر نے اسی نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ جرمنی میں بھی جہاں عمرانیات کی تحقیق کی طرف ابھی حال ہی میں توجہ کی گئی ہے، پروفیسر فرڈیننڈ کوٹنیش اور جارج رگل کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنی تحقیق میں مذکورہ بالا خصوصیت کو بدستور باقی رکھا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں جرمنی کی انجمن عمرانیات کا پہلا سالانہ اجلاس فرانکفرٹ (روڈیے میں) میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں تقریر کرنے والوں کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ صرف واقعات و حقائق پیش کریں اور اس بحث میں اپنی ذاتی رائے کو مطلق نہ داخل کریں۔ اس اجلاس کی تقریظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختلف صحبتوں میں جو مضامین پڑھے گئے ان میں سے ان سب حصوں کو صدر جلسہ نے علیحدہ کر دیا جن میں غیر دانستہ طور پر مضمون نگاروں نے اپنے فیصلہ اقدار کو شامل کر دیا تھا یہ

یہ سچ ہے کہ مالک متحدہ امریکہ میں ”عمرانیات“ کی اصطلاح بہت عرصہ تک علمی اور علمی دونوں مفہوموں پر حاوی تھی اور یہ دونوں معنی ایک دوسرے کے ساتھ پیوست خیال کئے جاتے تھے۔ مگر اب اس ہمہ امریکہ

۱۔ ملاحظہ ہو روبرمشل کا مضمون ”جرمنی کی انجمن عمرانیات اور اس کا پہلا اجلاس“ جو سنہ ۱۸۶۷ء میں ”بن الاقوامی مجلہ عمرانیات“ میں شائع ہوا۔

۲۔ ملاحظہ ہو ابنیاس مالک متحدہ امریکہ میں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

باب میں بھی جلیل القدر فضلاء عمرانیات کی تحقیق میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ وہ عمرانیات کی علمی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ لسٹ آف وارڈ نے ”علمی عمرانیات“ کی تصنیف سے بہت قبل ”خالص عمرانیات“ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اور اسی کو انھوں نے ہمیشہ زیادہ وضع خیال کیا۔ اسی طرح ایچ گڈنگز کی ”اصول عمرانیات“ فی الحقیقت ایک خالص علمی کتاب ہے۔ حال میں امریکی یونیورسٹیوں کے جو دستور عمل شایع ہوئے ہیں انھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرانیات کو ”خیرات“ اصطلاح کے ماتحت نہیں بلکہ دی گئی ہے بلکہ اب اس کے وجود کو علیحدہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ان سب باتوں سے آپ پر واضح ہو جانا چاہئے کہ اب اگر کہیں فقط عمرانیات کو ماہرین فن علمی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اس کے معنی میں سے علمی ہلو کو بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔

علم و عمل کے درمیان فرقی کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے اسے اب ہم اصولی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا بہترین ذریعہ یہ ہوگا کہ خود اس فرق کو اجاگر کر کے دکھائیں جس کا احساس دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ قدامت کے ہاں جو ”علمی“ اور ”نظری“ کی بحث تھی اس سے ہم اپنے آپ کو بالکل علیحدہ رکھیں گے اس لئے کہ اس کے الجھناؤ میں بڑھ کر پھر نکلتا بہت دشوار ہے۔ اس کے متعلق ہم بس اتنا کہیں گے کہ یہ بحث بہت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور ”نظری“ اور ”علمی“ میں جو باہم امتیاز کیا گیا ہے اس میں ایک حد تک صداقت کا پہلو نظر آتا ہے۔ قدامت کے ہاں ”نظری“ اسے کہتے تھے جس پر آدمی کو عمل کرنا چاہئے اور ”علمی“ اسے کہتے تھے جس پر آدمی عمل کر سکتا ہے۔ ”نظری“ کی نوعیت عام اور مجرد تسلیم کی جاتی تھی اور ”علمی“ کا شمار سوس اور معین میں ہوتا تھا۔ اگر ایک طرح سے دیکھئے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- عمرانیات کی پچاس سال کی تحقیق جو سنہ ۱۹۷۰ء میں ”امریکی مجلہ عمرانیات“ میں شایع ہوا۔

باب

تو یہ دونوں ایک دوسرے کی متضاد ہیں لیکن ویسے دھل ان میں بہت کچھ اشتراک خیال پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ”نظری“ اور عملی دونوں کا مدعا فی الحقیقت عمل ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کا نقطہ نظر بلند ہے اور دوسرے کا ذرا پست۔ مگر مقصد دونوں کے ایک ہی پیش نظر ہے۔ دونوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا پر اپنا اثر کیونکر ڈال جائے اور اپنی مصلحتوں اور اپنی خواہشوں کے مطابق اس کی کمیوں کو تنظیم کی جائے۔ مگر خالص علم کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد اثر آفرینی نہیں بلکہ معرفت ہے۔ علم کا مقصد یہ نہیں کہ دنیا کے لئے کوئی نئی راہ تلاش کرے بلکہ وہ تو اس کی جستجو کرنا چاہتا ہے کہ دنیا کیونکر اپنے لئے نئی نئی راہیں نکالتی رہی ہے۔ وہ دنیا کی رفتار میں تبدیلی پیدا نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو صرف معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی؟ اسی سے ہم علم اور فن کے فرق کا اندازہ ہو جانا چاہئے۔ فن کا مقصد عین ہے اور علم کا حقیقت۔ فن سے انسانی ظہن کے ضابطے مقرر ہوتے ہیں اور علم سے تو این وجود میں آتے ہیں۔ فن سے مستقبل کی تشکیل ہوتی ہے اور علم ماضی اور حال کی تحقیق کرتا ہے۔ چنانچہ فن کی نوعیت ہمیشہ موضوعی ہوا کرتی ہے اور علم کی معرفتی غرض ہے۔ ہمارے نزدیک فن اور علم کا وہی فرق مانا جاتا ہے جو قدما کے ہاں ”نظری علم“ اور عملی علم“ میں مانا جاتا تھا۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کرینی چاہئے کہ علم کا منکعب، یہ نہیں کہ وہ نظر سے بنائے بہ خلاف اس کے اس کا تو بس یہ کام ہے کہ حقائق کا ثبات کی تصدیق کرے۔ اگر علم کے باب میں ”نظریہ“ کا لفظ کبھی استعمال کیا جائے تو اس سے ایجابی تصورات کا مجموعہ مراد لینا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ اجتماعی زندگی کے معاملات میں انسان نے مدتوں تک صرف عمل کو اہمیت دی اور نظر سے اور فن تو کہیں بہت بعد میں جا کر وجود میں آئے۔ علم (سائنس)، ان سب کے بعد میں آیا۔ اس پر تعجب نہیں کہ انسان کے اور عالم طبیعی اور عالم نامی کے درمیان جو تعلق ہے اس کی نسبت علم کی تدوین مقابلہ جلدی وجود میں آئی۔ اس کی وجہ

یہ تھی کہ اس باب میں جس مواد سے واسطہ پڑا اس میں کسی قسم کی مطلق بات نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا علم بھی پہلے مدون ہوا۔ اس کے بالکل برعکس انسانی زندگی اپنے تئیں ان حقائق سے غلط فہم نہ کر سکی جو قمر ہا قرن سے اس کے وجود کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان حقائق کو تاریخ کہا جاتا تھا۔ ہمیں انیسویں صدی عیسوی میں جا کر اسے سارے طومار میں علمی نظم و ترتیب پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس خیال کو دو وجوہ کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پہلی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بدولت یہ احساس پیدا ہوا کہ فن کی رہنمائی کے لئے علم کا ہونا ضروری ہے۔ فی الحقیقت عالم عمرانی میں ہمارے عمل کی اثر آفرینی اور وسعت کا دار و مدار اس امر پر ہے کہ ہم اس کی اصلیت کو جانیں اور پہچانیں۔ پھر اس کے علاوہ قطع نظر اس کے افادہ عملی کے، علم بجائے خود ایک بیش بہا شے ہے۔ نفس انسانی کی اعلیٰ ترین خواہشیں اس سے پوری ہوتی ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن کی تربیت ہوتی ہے اور اسی کے توسط سے ہمیں اس رشتہ کا احساس ہوتا ہے جو انسان اور اس کے گرد و پیش میں ربط پیدا کرتا ہے۔ اسی کی بدولت ہم پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ سب انسان ایک ہیں اور وہ ایک دوسرے کے تابع ہیں۔ ان سب وجوہات کی بنا پر آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ علم نے کس قدر جلد ترقی کر کے اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لیا۔ ۱۰

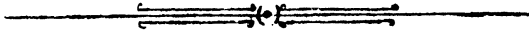
۱۰۔ مذکورہ بالا خیالات کے مزید تجزیے کے لئے ہم اپنی تصنیفات میں سے حسب ذیل کتب کی جانب توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں:۔ (۱) ”علم اور فن اجتماعی نقطہ نظر سے“۔ یہ مضمون کی صورت میں ”عمرانیات کی بین الاقوامی انجمن کے سالانہ“ کی پہلی جلد میں شائع ہو چکا ہے۔

(۲) ”مساکنات میں علم اور فن کی حیثیت“

(۳) ”نقطہ علوم اجتماعی“ کی پہلی جلد کا نوں باب اور تیسری جلد کا گیارہواں باب ملاحظہ ہو۔

باب

جس ہتہم با شان تحریک کے زیر اثر علوم کی تدوین ہوئی اسی تحریک کی بدولت عمرانیات بھی وجود میں آئی۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمرانیات کا تعلق نہ تو انسانی چلن سے ہے اور نہ ہم اس کے فن کہہ سکتے ہیں بلکہ وہ محض علمی نوعیت کی تحقیق ہے۔ اب ہمیں اس کی مخصوص نوعیت متعین کرنی ہے۔



تیسرا باب

عمرانیات کوئی اختصاصی علم نہیں ہے! ہم نے ابھی ابھی جس تحریک کا ذکر کیا ہے اس کے اثر سے انیسویں صدی عیسوی

میں متعدد اجتماعی علوم وجود میں آئے جنہوں نے مخصوص عمرانی تحقیق کے مقصد کو اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ ان علوم نے مختلف عہدوں اور مختلف مقاموں کی اجتماعی زندگی کے سلسلہ واقعات کی کڑیاں ملا کر اپنے نتائج اخذ کئے۔ چنانچہ ان علوم میں سے بعض کے نام یہ ہیں:—

(۱) تاریخ معاشیات یا علم المعیشت۔ اسے معاشیات کے فن سے جدا تصور کرنا چاہئے۔

(۲) تاریخ رسوم یا علم رسوم۔ اسے اخلاقیات سے الگ رکھنا چاہئے۔

(۳) تاریخ قانون یا علم فقہ یہ قانون بنانے والے یا جج یا وکیل کے فن سے ملحدہ چیز ہے۔

(۴) تاریخ ادارہ ہائے سیاسی یا سیاسیات۔ اسے علمی سیاست سے کوئی واسطہ

نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان علوم کے پہلو پہلو عمرانیات کی جگہ کہاں ہو گی؟

۱۔ ملاحظہ ہو فرمان فرمے کا مضمون ”علم اور فن“ یہ مضمون قاموس علم المعیشت میں شائع ہوا ہے جو کیون لے کے زیر ادارت طبع ہوئی ہے۔

۲۔ ملاحظہ ہو بیوی برڈل کی کتاب، اخلاق اور علم رسوم (مطبوعہ ۱۹۰۳ء) اور حقائق اخلاقی کا علم (مطبوعہ ۱۹۲۲ء)

بابت

اس ضمن میں ایک سیدھی سادی بات یہ پیش کی جاتی ہے کہ ان علوم کی دستبرد سے جو کچھ بچے اسے عمرانیات ایسا موضوع بحث قرار دے ان علوم میں سے ہر ایک کے تحت میں خاص قسم کے مظاہر اجتماعی آتے ہیں۔ بیشتر اس کے کہ ہم ان مظاہر کی اصلیت کی نسبت غور کریں زیادہ اچھا ہو اگر ہم پہلے ان عناصر کی تحقیق کر لیں جن کی بدولت وہ پیدا ہوتے ہیں نیز ان عناصر کی ترکیب کا پتہ چلائیں۔ چنانچہ علم الحیات میں بعینہ اسی طرح وظائف کی تحقیق سے پہلے اعضا کا بیان آتا ہے۔ اسی طرح سے اگر اجتماعی زندگی میں بھی مختلف اعضائے عمرانی کے الگ الگ علوم تدوین لائیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کے ذریعہ سے انسانی جماعتوں کی مختلف بناوٹوں یعنی معاشری عناصر کی گونا گوں گروہ بندیوں کا حال معلوم ہوگا۔ اگر ہم عمرانیات کا نصب العین یہی قرار دیں تو کیا یہ درست نہیں ہوگا؟ خود اس خیال کے دو پہلو ہیں۔ ایک عام پسند ہے اور دوسرا علمی۔ اب ہم ان دونوں کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

عام بول چال میں آپ نے ”مسئلہ اجتماعی“ کی نسبت بہت مرتبہ سنا ہوگا۔ اس سے معاشرہ کے مختلف طبقوں کی جنگ مراد لی جاتی ہے گویا کہ سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشمکش کے سوا معاشرہ کو اجتماعی زندگی کے کسی اور مسئلہ سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ یہ سچ ہے کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں نے اپنی تنظیم اس ڈھب سے کی ہے کہ اس سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ان کے روز کے جھگڑے آگے چل کر ایک ہولناک تصادم کی صورت نہ اختیار کر لیں۔ سب سے پہلے کارل مارکس نے اس کی جانب محققین عصر کی توجہ مبذول کرائی۔ کارل مارکس ہی نے سب سے پہلے طبقاتی جنگ کے واقعات کی چھان بین کی اور انھیں ایک عام کلیہ کے تحت میں پیش کیا۔ چنانچہ بعضوں کا عقیدہ ہے کہ اس نے عمرانیات کے مردہ جسم میں روح جھونک دی اور بعض تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ اسی نے سب سے پہلے عمرانیات کے علم کی بنیاد لی۔

میری دانست میں اس خیال کی غلطی اور ستم کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم معاشرہ کے مختلف طبقوں کی کشمکش کو بڑی اہمیت دینے سے انکار نہیں کرتے۔ جہاں تک ممکن ہو ہیں اس افسوس ناک حقیقت کو مٹانے یا اس کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے لیکن اس سے بھی بڑھ کر معاشرے کو اور دوسری کشمکشوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اقوام کے تصادم کے آگے لوگ طبقاتی جنگ کو بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ طبقاتی تصادم اور مصالحت کے علاوہ اور دوسرے ایسے بہت سارے مسائل ہیں جن کا تعلق اس فن سے ہے جو اجتماعی زندگی کے چلن میں برتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ عمرانی علوم طبقاتی جنگ و مصالحت کے واقعات کو قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے مگر ہم ان کا نتیجہ مقصد بھی صرف اس کو نہیں مٹھا سکتے۔ وہ علم جو انسانی گروہ بندیوں کی تحقیق اپنا موضوع قرار دیتا ہے اس مسئلہ کو جزوی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ جب آپ انسانی گروہ بندیوں کے متعلق تحقیق کرنے بیٹھیں گے تو آپ پر کھلے گا کہ معاشری طبقوں کے علاوہ آپ کو نسلوں، خاندانوں، قبیلوں، شہروں، ریاستوں، پیشوں، انجمنوں، اور ان تمام نظاموں کا جائزہ لینا ہے جنہیں ہم آئندہ ابواب میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ چنانچہ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ اور دوسرے نظام اجتماعی کو پس پشت ڈال کر عمرانیات محض طبقاتی کشمکش کے واقعات پر اپنا دائرہ بحث محدود کر دے۔ بلاشبہ معاشرہ کے مختلف طبقوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا ضروری ہے مگر یہ تو نہیں ہوتا کہ عمرانیات بس اس سے آگے اپنا قدم ہی نہ بڑھائے۔

عمرانیات کے دائرہ بحث کے متعلق جو یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ اسے صرف معاشرہ کے مختلف طبقوں کے متعلق واقعات کی تحقیق کرنی چاہئے۔ اگرچہ بالکل بے بنیاد خیال ہے مگر اس میں ذرا سا صداقت کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ جس طرح صرف معاشرہ کے طبقوں کے ذکر کو ہم

باب

عمرانیات سے تعبیر نہیں کر سکتے اسی طرح ہر گروہ بندی کے متعلق تحقیق کرنا عمرانیات کے دائرہ بحث سے خارج ہے چنانچہ بعض علماء عمرانیات نے اس مسئلہ کی نسبت کوئی پچیس سال ہونے آئے اپنے خیالات ظاہر کئے تھے۔ یہ رہے عمرانیات کے تصور کی علمی نوعیت جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ یعنی یہ کہ عمرانیات کو صرف اجتماعی زندگی کی مختلف صورتوں سے بحث کرنی چاہئے اور اس سے معاشیات، علم رسوم اور سیاسیات کیلئے ان کے وظائف کی تحقیق چھوڑ دینی چاہئے۔ عمرانیات کسی معاشرہ کے عناصر انسانی کی تحقیق کر کے یہ بتا سکتی ہے کہ ان پر عناصر غیر انسانی یعنی زمین، ماحول، جمادات، نباتات، اور حیوانات کا کیا اثر مرتب ہوا ہے وہ مختلف انسانی گروہ بندیوں کی نسبت جن کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے تحقیق کر کے نتائج اخذ کرے گی۔ عمرانیات کے موضوع کی یہ دونوں نوعیتیں گویا اس سنگ بنیاد کا کام دیں گی جن پر ان علوم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے جو اجتماعی وظائف اور اس کی بے شمار پیچیدگیوں سے بحث کرتے ہیں۔

عمرانیات کے متعلق مذکورہ بالا نقطہ نظر زیادہ مقبول نہیں ہوا بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اجتماعی عناصر کی تدوین عمرانیات کے وجود میں آنے سے قبل دوسرے علوم کر چکے تھے اور عمرانیات کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچا کہ ان علوم کو ان کے موضوع سے محروم کر دے۔ چنانچہ علم نسل اور علم مردم شمارہ بہت قدیم زمانے سے رابہ چلے آ رہے ہیں مومن الذکر میں انسانی آبادی اور اس کی اچھوٹی چھوٹی تقسیموں سے بحث کی جاتی ہے۔ ابھی حال میں ایک اور نیا علم نکلا ہے اور خوب ترنی پر ہے۔ اس سے ہماری مراد انسانی یا عمرانی جغرافیہ ہے۔ اس کا موضوع تحقیق یہ ہے کہ انسان اور اس کے گرد و پیش کے مابین کیا تعلق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا نوعیت کی علمی تحقیق عمرانیات کے تحت نہیں لاسکتے جس زمانے میں اجتماعی وظائف کے علوم وجود میں آ رہے تھے اسی زمانے میں عمرانیات

کی نئی نئی اصطلاح بنی تھی۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے متعلق دوسرے علوم کھلیے باب
 ”علم ترکیب اجتماعی“ کی اصطلاح بنائی گئی۔ اس سے یہ فائدہ تو
 ضرور ہوا کہ ”عمرانیات“ کو عام طور پر ایک مخصوص علم کی حیثیت حاصل ہوئی
 چنانچہ ماہرین عمرانیات کی مرضی کے مطابق لفظ عمرانیات اپنے وسیع
 معنوں میں رائج ہو گیا۔ ظاہر ہے ماہرین عمرانیات کی یہ خواہش بالکل فطری
 تھی کہ اس لفظ کے معنی محدود نہ ہونے پائیں۔ ان کی یہ خواہش بالکل اسی طرح
 تھی جیسے علم کائنات اور علم الحیات کے ماہروں کی خواہش کے موافق یہ
 دونوں علوم پوری فطرت طبعی اور فطرت حیاتی پر حاوی ہیں۔ اسی طرح علمائے
 عمرانیات اپنے علم کو پوری فطرت اجتماعی پر حاوی کرنا چاہتے تھے۔ دراصل
 عمرانیات کے بانی آگست کومت نے اس کا یہی تصور قائم کیا تھا اور اسی سبب
 پر اس کی تدوین کی گئی۔ عمرانیات کی جو تعریف ہم نے پیش کی ہے کوئی وجہ
 نہیں کہ ہم اسے غلط سمجھیں۔ ہاں ”عمرانیات“ کی جو اصطلاح ہے اس پر
 اجتماعی حقیقت کی کسی ایک شاخ کو پورے طور پر قابض ہونے کا دعوے دار
 نہیں ہونا چاہئے، چاہے بجائے خود وہ شاخ کتنی بھی مفید کیوں نہ ہو۔ چنانچہ
 ان اسباب کی بنا پر عمرانیات کو اختصاصی علوم کی صف میں جگہ نہیں مل سکتی تھی۔

۱۔ ”عمرانیات کے سالنامے“ میں یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

۲۔ ہم نے اپنی کتاب ”فلسفہ علوم عمرانی“ میں منطقی اصول پر مبنی عمرانی کی فہرست
 درج کی ہے۔ ملاحظہ ہو درجہ اول۔ دسواں اور گیارھواں باب۔ ان ابواب کا عنوان ”علوم
 اجتماعی کا متباغے مقصد“ ہے۔

پوچھا باب

کیا ہم عمرانیات کو معاشرے کی ہم ابھی یہ بتا چکے ہیں کہ عمرانیات ہمارے عام تحقیق سے تعبیر کر سکتے ہیں؟ نزدیک نہ تو اجتماعی زندگی کا فن ہے اور نہ یہ کوئی اختصاصی علم ہے۔ چنانچہ اس کا موضوع

سوائے معاشرہ کی عام تحقیق کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں ہم آگست کونت کے خیال کا نتیجہ کر رہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ اس نے جس علم کی بنا ڈالی تھی وہ اب بہت کافی ترقی کر چکا ہے۔ جوں جوں عمرانیات کا علم وسیع ہوتا گیا اس قدر اس میں نئے نئے مسائل کے شائع ہونا پیدا ہوتے گئے۔ اب ہم آگست کو بہت کے مثل اس پر اکتفا نہیں کر سکتے ہیں کہ عمرانیات کی مجموعی تعریف کر دیں اور بس۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی تعریف کرتے وقت کمال صحت کو ملحوظ رکھیں۔

ہم نے ابھی عمرانیات کی جو تعریف کی تھی اس کی دو تاویلیں کیجا سکتی ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ عمرانیات اجتماع انسانی کی عام تحقیق سے تعلق رکھتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ وہ بجائے خود ایک مکمل علم ہے اور اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ عمران بشری کے مختلف پہلوؤں کی عام تحقیق کرتی ہے۔ یہ دونوں تصورات اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں اور ان دونوں کے حمایتی موجود ہیں۔

اسل درکیم پہلے خیال کے طرف داروں میں ہے۔ اس کا خیال باب ہے کہ عمرانیات علوم اجتماعی کے لئے بمنزلہ ضابطہ نظام ہے۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سارے اجتماعی علوم دراصل عمرانیات ہی کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اسل درکیم نے اپنے ”سالنامہ عمرانیات“ میں ہر جگہ اجتماعی علوم کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس جگہ میں ان تمام تصانیف کے اقتباس شایع کئے جاتے ہیں جو عمرانیات دینی، عمرانیات اخلاقی، عمرانیات قانونی اور عمرانیات معاشی پر شایع ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ علم دین، علم اخلاق، فقہ، اور علم المعیشت کو ہر جگہ عمرانیات کے اجزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جن میں اصول مشرک کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ غرض کہ عمرانیات عبارت ہے ان سب علوم کی باہمہر پیوستگی اور ان کی تکمیل سے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ان سب عناصر کے مجموعہ کا نام عمرانیات ہے۔

اب آئیے عمرانیات کے دوسرے تصور پر غور کریں۔ اس میں یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان سب علوم کو جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ایک دوسرے سے بالکل آزاد سمجھا گیا ہے اور ان کی خصوصیات کو بین طور پر ایک دوسرے سے جداگانہ نوعیت دی گئی ہے۔ مثلاً علم دین فقہ سے مختلف ہے اور اسی طرح علم رسوم علم المعیشت سے بالکل الگ ہے۔ ان کے باہمی اختلاف اس قدر صریح ہیں کہ ان سمجھوں کو ایک ہی اصطلاح کے تحت میں لانا ناممکن نہیں۔ پس لازم ہے کہ مختلف لوگ ان کی الگ الگ تحقیق کریں۔ اس لئے کہ کوئی علمی کام بھی بغیر تقسیم عمل کے اصول پر کاربند ہو سکتا ہو۔ اور انہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ ان مختلف علوم کے درمیان ایک قسم کا ربط و تعلق پیدا کر دیں۔ چونکہ ہر علم حقیقت

لے ملاحظہ ہو ”عمرانیات و علوم اجتماعی“ جس میں ای درکیم اور بی ناگوانے اس نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ یہ مضمون ”مجلہ فلفہ“ میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ صفحہ ۲۶۵۔

باب

عمرانی کے صرف ایک رخ کا مطالعہ کرے گا اس لئے جب یہ سب علوم علیحدہ علیحدہ اپنی تحقیق کے کمال پر پہنچ چکیں گے تو اس وقت یقیناً ہم ان سب کے نتائج کا موازنہ کر کے ان میں ایک رشتہ اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ سے ہم اس کل کا تصور قایم کر سکیں گے جس کے الگ الگ اجزاء کی تحقیق ان علوم نے کی ہے۔ دراصل عمرانیات کو یہی کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس نقطہ نظر کے مطابق عمرانیات مخصوص اجتماعی علوم کو اپنے میں ضم نہیں کرے گی بلکہ وہ ان سب کے لئے طرہ امتیاز کا کام دے گی۔ یہ سچ ہے کہ ہم اسے ان علوم کی مکمل عمارت سے تشبیہ نہیں دے سکتے مگر باں ہم اسے عمارت کے اس بالائی حصے سے ضرور تعبیر کر سکتے ہیں جو ساری عمارت کے لئے مشترک حیثیت رکھتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں مذکورہ بالا تصورات میں سے ہم کسے قابل ترجیح خیال کرتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کریں، یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کی حدود متقرر کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں تصورات میں ایسا زیادہ فرق نہیں ہے۔ ورکیم کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عمرانیات کی مخصوص تحقیقات کے ساتھ ساتھ عمرانیات کے عام نتائج کی تحقیق بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں وہ خود کہتا ہے۔ بلاشبہ صرف اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو ٹھیک ہے کہ اجتماعی علوم جب خوب ترقی کر چکیں گے تو یہ ممکن ہوگا کہ ان کے نتائج میں ربط قایم کیا جائے۔ اس طریقہ سے وہ عام اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں جو ان نتائج میں مضمر ہیں۔ میرے نزدیک اگر اجتماعی علوم کے مسئلہ کو اس طور پر پیش کیا جائے تو اس میں کوئی ناقابل حل دشواری نہیں باقی رہتی۔ دوسرے تصور کے مطابق اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ مخصوص علوم اجتماعی کے باہر رہنے کے لئے یہ بہت مفید ہے کہ وہ ان

علوم سے بھی واقفیت ہم پہنچائیں جو ان کی تحقیق سے قریب کا تعلق رکھتا ہے۔
 ہیں تاکہ وہ ان کی ترقی سے باخبر رہیں اور ان کے تحقیقی نتائج سے اپنے نام
 میں مدد لیں۔ اس طرح وہ ان لوگوں کے ساتھ یک جہتی محسوس کریں گے
 جو ان کے علم سے ملتے جلتے دوسرے علوم پر کام کر رہے ہیں۔ اس
 سے یہ ہوگا کہ وہ ان سمجھوں کو اپنی وسیع برادری میں شامل سمجھیں گے۔
 اگر ان امور کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے تو ان دونوں مذکورہ بالا
 تصورات میں خفیف سے اصطلاحی فرق کے سوا اور کوئی بنیادی اختلاف
 نہیں نظر آئے گا۔ درحقیقت کے نزدیک عمرانیات تمام اجتماعی علوم کے
 مجموعہ سے عبارت ہے۔ اگر آپ اجتماعی علوم کے مجموعی نتائج کو علیحدہ
 نام سے موسوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ "عمرانیات عام" کی اصطلاح اس
 کے لیے وضع کر سکتے ہیں۔ دوسرے تصور کے مطابق اجتماعی علوم اصولی
 طور پر اپنا ایک علیحدہ آزاد وجود رکھتے ہیں اور ان کے مجموعی نتائج کی تحقیق
 کو عمرانیات کہتے ہیں۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کے ساتھ
 لفظ "عام" کا دم چھلا خواہ مخواہ لگایا جائے۔ جو محققین اس تصور کے
 حامی ہیں وہ کہتے ہیں کہ خود علم عمرانیات کی اصلیت کا یہ اقتضا ہے کہ وہ
 عام نوعیت رکھتی ہو۔

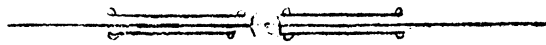
چونکہ یہ بحث صرف لفظوں کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا
 ہے کہ اسے اور زیادہ آگے نہ بڑھایا جائے۔ دراصل الفاظ کی تعریف
 مختلف نقطہ ہائے نظر سے کی جاسکتی ہے اور اس میں ہر شخص کو آزادی حاصل
 ہے کہ جو نقطہ نظر چاہے اختیار کرے۔ لیکن چونکہ کسی علم کی تحقیق میں
 اصطلاحوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے ضرور ہے کہ ہم عمرانیات
 کی اصطلاحوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کر دیں۔ ہم اسی اصطلاح کو
 ترجیح دیں گے۔ جس سے خود نفس عمرانیات کو فائدہ پہنچے۔ آپ جانتے

باب

ہیں کہ اس وقت عمرانیات کے عام طور پر رائج ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ اختصاصی علوم کے ماہروں کی طرف سے پیدا کی جا رہی ہے۔ انھیں یہ خوف ہے کہ کہیں عمرانیات کے وسیع حلقہ میں خود انکا موضوع تحقیق ضم نہ ہو جائے۔ دراصل اجتماعی فنون کے ماہروں کو اس قسم کا اندیشہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ تو نہیں نظر آتی اس لئے کہ عمرانیات خود علمی زندگی میں براہ راست دخل دینے سے احتراز کرتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے مخصوص اجتماعی علوم کے ماہروں کی عمرانیات کی طرف سے بدظنی بدستور علی آتی ہے۔ چنانچہ ایک مشہور ماہر علم المعیشت نے جوئے نئے خیالات کو جذب کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں چاہے پورے طور پر انھیں ان سے اتفاق ہو یا نہ ہو، علمائے عمرانیات کو خطاب کرتے ہوئے ایک مرتبہ اپنے رفقاء کے ان اندیشوں کا ذکر کب جہان کے دلوں میں عمرانیات کی طرف سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس ماہر علم المعیشت کا نام موسیٰ وائل کیوسیر ہے۔ انھیں عمرانیات کی بین الاقوامی انجمن نے سنہ ۱۹۳۸ء کے لندن کے اجلاس کے لئے صدر منتخب کیا تھا۔ چنانچہ اس اجلاس کی افتتاحی تقریر میں موصوف نے علمائے عمرانیات کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انھیں بڑے بڑے دعووں سے احتراز کرنا چاہئے اور فردنی اختیار کرنا چاہئے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے اس موقع پر جو بیحد کہا لفظ بہ لفظ درست ہے۔ اس وقت عمرانیات کے حامیوں کو جس چیز کی سبب سے زیادہ ضرورت ہے وہ خاکساری کا جذبہ ہے۔ اگر عمرانیات اپنے حوصلوں اور انگلیوں کو ضبط کے تحت لے آئے تو امید ہے کہ وہ بہت جلد عام طور پر مقبول ہو جائے گی۔ اگر آج وہ یہ دعویٰ کرنا ترک کر دے کہ وہ جستجاشی علوم کے مجموعے سے عبارت ہے، تو ایسی صورت میں توقع ہے کہ دوسرے اجتماعی علوم کے ساتھ اس کا سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ اگر

سنہ "عمرانیات کی بین الاقوامی انجمن کی سالانہ رپورٹ" ملاحظہ ہو۔ جلد گیارھویں، صفحہ ۶۹، ۷۰، ۷۱

عمرانیات دوسرے مخصوص اجتماعی علوم کی آزادی کو معرض خطر میں نہ ڈالے۔
 تو یقیناً یہ علوم بھی اس کی بقا اور اس کے حق حیات کو تسلیم کر لیں گے۔
 اس طریقہ سے باہمی سلوک و رعایت سے یہ فائدہ ہو گا کہ سارے
 اجتماعی علوم کی اپنی اپنی الگ الگ حدود متعین ہو جائیں گی اور خود
 نفس علم کی بڑی خدمت ہو سکے گی۔ دراصل متحدہ ہیں بڑے فائدے
 ہیں۔ اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ ہمارے نزدیک عمرانیات کو
 اسی اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے میں وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ
 امن و صلح کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گی اور وہ سب کے سب اس
 کے مدد و معاون بن جائیں گے۔ چنانچہ علمائے عمرانیات کا یہ فرض ہے
 کہ عمرانیات کو اس کی مقررہ حدود سے باہر نہ نکلنے دیں۔ آخر میں اس
 پوری بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عمرانیات ہمارے نزدیک
 اجتماعی علوم کے مجموعے کو نہیں کہتے بلکہ وہ ان کے باہمی امتزاج کا نام
 ہے۔



پانچواں باب

ہم نے پچھلے ابواب میں عمرانیات کی جس خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے اب اس کے نتیجہ کو ذرا اور اجاگر کر کے پیش کرتے ہیں۔ دراصل یہی نتیجہ ہماری اس ساری تحقیقات کا لب لباب ہے جو اب تک ہم نے کی ہیں۔ ہم نے ابھی یہ کہہ سکتا تھا کہ عمرانیات سارے مخصوص اجتماعی علوم پر حاوی ہے، ان علوم نے پورے عالم عمرانی کو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے اور عمرانیات ان مختلف حصوں میں رشتہ اتھاؤ کا کام کرتی ہے۔ ان علوم میں سے ہر ایک کے پیش نظر ایک متعین مقصد ہوتا ہے، اور عمرانیات ان سبھوں کے متحدہ مقصد کو اعلیٰ نقطہ نظر سے پیش کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مخصوص علوم ہی کو ہم علوم کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ عمرانیات تو دراصل ان سب علوم کا فلسفہ ہے۔ چنانچہ عمرانیات کی تعریف کے باب میں ہم اپنی تحقیق کے اس آخری نتیجہ پر پہنچ گئے کہ عمرانیات دراصل مخصوص اجتماعی علوم کے فلسفہ کو کہتے ہیں۔

ہم اس موقع پر اس بحث کو چھیڑنا بے سود سمجھتے ہیں کہ فلسفہ اور علم میں ماہر الایماز کیا کیا ہیں؟ اس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ فلسفہ ایجابی یا فلسفہ علوم سے جس قسم کی تحقیقات مراد لی جاتی ہے اس کی نوعیت خالص علمی تحقیق سے مختلف ہو آگرتی ہے۔ آگرت کوئٹ نے اپنی کتاب ”فلسفہ ایجابی کے اسباق“ میں اس فرق کو اچھی طرح سے واضح کیا ہے۔ فلسفہ اور علم میں بس وہی فرق ہے

جو تجزیہ و ترکیب میں ہوتا ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ مخصوص حقائق کی تصدیق یا تردید کرے اور ان سے قوانین اخذ کرے۔ اور اعلیٰ مسائل پر بحث کرنے کا تعلق فلسفہ سے ہے۔ کسی علمی موضوع کے عام مسائل کی تحقیق کو سس علم کا فلسفہ کہتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد کسی تحقیق کے ابتدائی اور انتہائی مسائل کے حل سے ہے۔ کسی علمی تحقیق کو شروع کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ آپ اس علم کا مہتابے نظر اور اس کا طریقہ تحقیق متعین کر لیں اور یہ تحقیق اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جائے گی جب تک کہ آپ نے اپنے نتائج کا استنباط نہ کر لیا ہو۔ اگر آپ اس اصول کو عمرانیات پر عائد کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کیونکر اس کی بدولت اجتماعی علوم میں ہم آہنگی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ عمرانیات اصولی طور پر خاص خاص اجتماعی علوم کے دائرہ بحث کو متعین کرتی ہے اور انہیں اس طریقہ سے آگاہ کرتی ہے جس کی کسوٹی پر انہیں واقعات کی جانچ کرنی چاہیے اس طور پر اجتماعی علوم کا طریقہ تحقیق میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے اور ان علوم کے دائرہ بحث کے مقرر ہو جانے سے ایک تو یہ ہوتا ہے کہ سارے مظاہر عمرانی کسی نہ کسی علم کے تحت میں آجائے ہیں اور دوسرے یہ کہ ایک علم دوسرے علم کے طبقہ میں ہے جالغیر اور دخل اندازی نہیں کر سکتا چنانچہ اسکی وجہ سے کسی مسئلہ کی جھان بین میں دوسری محنت بچ جاتی ہے اور ہر علم دوسرے کے طریقہ تحقیق اور تجربے سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اگر ایک جگہ کوئی خاص طریقہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا تو دوسرے علوم بھی اسے اپنے خاص حالات سے مطابقت کر کے استعمال کر سکتے ہیں۔ پھر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ عمرانیات کی بدولت ان سارے علوم کے نتائج تحقیق ایک جگہ جمع کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ عمرانیات اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ حقائق عمرانی کے مختلف پہلوؤں کو آپ چاہے تحقیق کی آسانی کی وجہ سے غرضی طور پر ایک دوسرے سے جدا کر لیں مگر واقعی زندگی میں یہ سب پہلو

باب

آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف عناصر کا باہم تعاون ضروری ہے اس لئے کہ وظائف عمرانی با یکدیگر مربوط ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ انسان کے ارتقا کی منزلیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ان کا سلسلہ برابر جاری چلا آتا ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عمرانیات کی بدولت اجتماعی علوم کی ابتدائی اور انتہائی حالتوں میں کیونکر ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عمرانیات کا کام یہی ہے کہ اس امتزاج کی تکمیل کرے۔

لیکن کیا اس کی کوئی صورت ممکن ہے کہ ہم کسی علم کی ابتدا اور انتہا کو ایک دوسرے سے الگ واضح کر سکیں؟ نظری اعتبار سے بیشک یہ ممکن ہے لیکن عملی طور پر اس میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ عینی نقطہ نظر سے ہم ان میں فرق کر سکیں۔ مثال کے طور پر یہ فرض کیجئے کہ اجتماعی علوم کی کوئی تحقیق یا یہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ ضرور ہے کہ اس تحقیق کی ایک تمہید ہو اور آخر میں اس کا نتیجہ ہو۔ فی الحقیقت یہی تمہید اور نتیجہ عام عمرانیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اول تو ہم یہی نہیں فرض کر سکتے کہ اجتماعی علوم کی کوئی تحقیق واقعی مکمل ہو چکی ہے۔ دراصل اس عمارت کی تکمیل ہنوز باقی ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہو اس وقت تک دونوں کام ساتھ ساتھ چلتے رہنے چاہئیں۔ یعنی یہ کہ مخصوص اجتماعی علوم کی الگ الگ تحقیق کا کام بھی جاری رہنا چاہئے۔ اور عمرانیات کو بھی ساتھ ساتھ اپنی تمہید و نتائج کو وسیع کر کے علم کی اصلی صورت میں پیش کرنا چاہئے۔ اس طور پر جوں جوں مخصوص اجتماعی علوم ترقی کرتے جاتے جاتے جاتے بدوش عمرانیات بھی اپنی تکمیل کرتی جائے گی۔ چاہے نظام ہر یہ بات کتنی بھی تعجب انگیز کیوں نہ معلوم ہو۔ لیکن یہ صورت ممکن ہے کہ اجتماعی علوم کا یہ ابتدائی اور آخری کام ساتھ ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ چنانچہ آئندہ جب ہم اس پر

بحث کریں گے تو جان لو جھک مختلف علوم اجتماعی اور عمرانیات کو خواہ مخواہ باب ایک دوسرے سے بالکل جدا کر کے نہیں پیش کریں گے۔ جہاں کہیں ہم ان کے باہمی اختلاف کو ظاہر کریں گے وہاں یہ ضروری نہ ہو گا کہ ہم ان عمرانیات سے متضاد کر کے دکھائیں۔ بلکہ ہم صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہم نے پچھلے ابواب میں جس تحقیق کا ذکر کیا ہے اسے عمرانیات کے ضمن میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان ابواب میں ہم نے عمرانیات کی اہمیت کو تجربی طور پر متعین کر لیا ہے۔ اب آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ کیونکر قابل محسوس طور پر عمرانیات نے اپنے منصب کو نبھا یا۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہو گا کہ ہم ان نتائج کی چھان بین کریں جو محض عمرانیات کی بدولت منظر عام پر آئے۔ ظاہر ہے اس کے لئے بڑی تفصیل درکار ہے مگر چونکہ اس کتاب کا دائرہ بحث محدود ہے اس لئے ہم اس کے اندر رہنے کی کوشش کریں گے۔ پھر بھی اتنا تو ہم ضرور کریں گے کہ ان سب امور کی جانب اشارہ کر دیں جن کا تعلق عمرانیات کے موضوع کے اہم مسائل سے ہے۔ اب عمرانیات کے منطقی نتائج مقصد کو پیش کر دینے کے بعد ہم اس کے اصلی موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حصہ دوم

چھٹا باب

عمرانیات کا موضوع بحث

معاشرہ اور اجتماعی تعلقات | کائنات مدرکہ کی جملہ موجودات کو ہم تین بڑی بڑی مدوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، غیر جاندار، جاندار اور معاشرہ۔ انھیں کو دوسرے لفظوں میں غیر نامی، نامی اور فوق نامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کائنات کے یہ تینوں اجزا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست بھی ہیں اور اگر ایک دوسرے اہم پہلو سے دیکھتے تو ایک دوسرے پر حاوی نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فوق نامی کی ساخت عناصر نامی سے ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے نامی کی بناوٹ میں غیر نامی عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ چنانچہ فوق نامی اور نامی کی ترکیب کا ڈھنگ غیر نامی سے مطلق نہیں بنتا۔ غیر نامی ان دونوں سے مواد حاصل کر کے اسے نئی نئی شکلیں دیتا رہتا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ عالم اجتماعی اور عالم نامی کے درمیان

جو تعلق ہے اس کی کیا نوعیت ہے؟ ایک عام تعلق ان دونوں میں نظام ہر بات یہ پایا جاتا ہے کہ عالم اجتماعی بھی اہل میں حیات ہی کے ایک پہلو کا نام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نظام حیات میں دو قسم کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک وہ اندرونی تعلق جو کسی ایک عضو کے مختلف اجزاء کے درمیان ہوتا ہے اور دوسرا وہ خارجی تعلق جو ایک عضو اور دوسرے عضو کے درمیان ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے تعلق کی تحقیق علم الحیات کا موضوع ہے اور دوسری قسم کے تعلق کو عمرانیات اپنا موضوع بحجت قرار دیتی ہے۔

اگرچہ اس مسئلہ کی نسبت آئندہ متعدد تہرے ہم ذکر کریں گے مگر اس جگہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس سارے مسئلہ کی اصلیت بس اتنا اتنا ذکر کرنے پر منحصر ہے کہ اندرونی نامی تعلقات ہمیشہ غیر شعوری طور پر وجود میں آیا کرتے ہیں۔ برعکس اس کے خارجی اجتماعی تعلقات ہمیشہ اصولاً شعوری ہوتے ہیں۔ ذی روح ہستیاں پاہی صلاح مشورے سے اپنے خارجی تعلقات و اعمال کو شعوری تصور کے تابع رکھتی ہیں۔

چنانچہ اس اصول کی صراحت کے ساتھ ہم پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ عالم نامی اور عالم اجتماعی کی وسعتیں برابر نہیں ہیں۔ عالم اجتماعی دراصل عالم نامی کے سامنے بہت چھوٹا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے صرف ذی روح ہستیاں ہی قائم کر سکتی ہیں۔ سیاروں اور سالمات کی اجتماعی زندگی استعارہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ذیل میں ہم اس خیال کی مزید تشریح کریں گے کہ کیونکہ ہم عالم اجتماعی کو مختلف حیثیتوں سے بمقابلہ عالم نامی کے محدود سمجھتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہے اس تصور کو صحت کے ساتھ پیش کریں۔

اول تو ہمیں یہ بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جانداروں میں بعض ایسے ہیں جو معاشرہ میں زندگی نہیں بسر کرتے۔ مثلاً نباتات۔ یہ ہیں شلیم

بابت

ہے کہ بعض دفعہ اس خیال کی تردید کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دو مختلف انواع کے نباتات میں اور ایک ہی نوع کے مختلف نباتات میں اجتماعی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ اول الذکر کی مثال ہمیشہ پتوں (Champignon) اور کائی میں ملتی ہے جو ملکر لنش (Linchen) کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آخر الذکر کی مثال ہیں شاہ بلوط شمشاد اور چٹھہ کے درختوں میں ملتی ہے جن کے جھنڈوں سے جنگل بنتے ہیں۔ اس دوسری مثال سے آپ ایک اور تیسری مثال بھی نکال سکتے ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ جنگل میں صرف ایک ہی نوع کے نباتات نہیں ہوتے بلکہ چھوٹے بڑے سب ہی قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک نوع کے درخت دوسرے انواع کے مقابلہ میں کثرت سے پائے جاتے ہوں جس کی بدولت اس جنگل کی ایک خاص خارجی صورت پیدا ہو جائے اور اس کا ایک خاص نام پڑ جائے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے درختوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے بڑے بڑے درختوں کے سایہ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ہیں باغات میں ملتی ہے جہاں درخت ایک طرح کی اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس موضوع کا تعلق علم نباتات سے ہے۔ اس علم کی تحقیق میں ان دلچسپ مسائل کی نسبت معلومات دستیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ درخت جو قریب قریب ہوتے ہیں آپس میں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں اور ان کی حیات نامی ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس اثر و تاثر کی تہ میں قریب مکانی کا اصول کار فرما ہوتا ہے اور اس کے اسباب یا تو طبیعی نوعیت کے ہوتے ہیں یا ان کا تعلق علم حیاتیات سے ہوتا ہے جس طرح نباتاتی جغرافیہ کا علم اس اثر کی تحقیق کرتا ہے جو زمین اور آب و ہوا کسی خاص درخت پر ڈالتے ہیں اسی طرح نباتاتی عادات کے

علم میں ان کی باہمی اثر آفرینی کے متعلق چھان بین کی جاسکتی ہے۔ باب
لیکن اگر ہم اس جگہ ”نباتاتی عمرانیات“ کا ذکر کریں تو غالباً یہ ذرا
قبل از وقت ہوگا۔

نظم حیات کے ارتقا میں عالم نباتات کے بعد عالم حیوانات
کا درجہ ہے۔ اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں کہ عالم حیوانات میں
صحیح معنی میں اجتماعی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ حقیقت مدتوں سے
مسلم علی آتی ہے اور اس کے متعلق متعدد فاضلوں نے تحقیق کی ہے۔

الفیض اسپیناس نے اپنی مشہور کتاب ”حیوانی معاشرے“ میں اس
مسئلہ کی نسبت نہایت قابل قدر معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ پھر اس کے
بعد اور دوسروں نے بھی اس موضوع پر نظم فرسائی کی لیکن سوائے
ضمنی تفصیلات کے اور کوئی خاص اضافہ نہیں کیا گیا۔ ہم اس جگہ
صرف اس قدر اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ بعض ذی شعور
جانوروں میں گروہ بندی بالکل عمرانی اصول پر ہوتی ہے اور بعض جانوروں
کی گروہ بندی میں یہ خصوصیت اس قدر نمایاں نہیں ہوتی۔ چنانچہ
Siphonophores میں اگرچہ ہیں کسی قسم کی گروہ بندی نہیں نظر آتی

Ascidies

مگر یہ کہ وہ تقسیم کار کے اصول پر سختی سے پابند ہوتے ہیں۔
کا بھی بعینہ ہی حال ہے۔ ان میں بھی تعاون عمل پایا جاتا ہے لیکن
یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی زندگی اجتماعی اصول کے تابع ہے
مذکورہ مثالوں میں معاشروں کا وجود نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ

Hymenopteres

یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہایت سیدہ نظم حیات کے نمونے ہیں مگر
کے گروہ ہوا ہے وہ چوتھی کی قسم سے ہوں یا شہد کی مکھی کی قسم سے
مچھلیاں، چڑیاں، اور دودھ پلانے والے جانور اجتماعی اصول پر زندگی
نہیں کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے جسموں کی ساخت ان جانوروں کی ساخت
سے بالکل مختلف ہوتی ہے جن کی نسبت ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے۔
موخر الذکر کے اعضا کی بناوٹ میں شعور و اختیار کو دخل ہوتا ہے حالانکہ

باب

اول الذکر کے اعضا کی ساخت غیر ارادی اتحاد سے عبارت ہوتی ہے۔ پھر ان دونوں کی نفسانی زندگی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ سو خوالذکر کی گروہ بندی افراد کے اشتراک مقصد کا نتیجہ ہوتی ہے مگر اول الذکر کے ہاں اس قسم کی کسی نفسانی کیفیت کا پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ ان مثالوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ معاشرے وہیں وجود میں آتے ہیں جہاں عقل و شعور کی کار فرمائی ہے۔

اب آخر میں انسان کو لیجئے۔ یہ امر یہی ہے کہ انسانی زندگی میں اجتماعی اصول کو خوب فروغ ہوا۔ اور ہمیں بھی اپنی تحقیق کی خاطر مختلف قسم کے معاشرہ میں انسانی معاشرے سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اب سوال یہ ہے انسانی معاشرہ میں وہ کون سے معاشرے ہیں جو ہماری توجہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں اس باب میں دو مختلف نقطہ ہائے نظر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ آگست کونت کے زمانہ میں جب عمرانیات نئی نئی وجود میں آئی تھی اس وقت اس کی تحقیق کا رجحان اعلیٰ انسانی معاشرہ کی جانب مائل تھا۔ جسے اس کی یہ تھی کہ عمرانیات کے پیش نظر صرف مغربی دنیا تھی۔ مغربی معاشرے کے علاوہ عمرانیات دنیا کے دوسرے معاشرہ کو بھی سمجھتی تھی۔ لیکن آج کل عمرانیات کا رجحان اس کے بالکل برعکس پایا جاتا ہے۔ امیل ورکیم کے مسلک کے محققین، جو انگریزی ماہرین علم الانسان اور ماہرین مسا غیر سے بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں ان قدیم انسانی آبادیوں کی تحقیق پر بہت زور دیتے ہیں جو ابھی تمدن کی بالکل ابتدائی حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ غرض کہ عمرانیات کے ان دونوں رجحانوں کے متعلق آپ کو دلائل ملیں گے۔ ورکیم کا خیال ہے کہ انسانی آبادیوں کی ترقی یافتہ صورت کو بخوبی سمجھنے کے لئے ان کی ابتدائی حالت کا جاننا از بس ضروری ہے۔ نی تحقیقت اس کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے مگر آگست کونت کے ہاں اس کا یہ جواب

بابت ملے گا کہ عمرانیاتی تحقیق کو محض زمانہ قبل از تاریخ کے لئے مخصوص کر دینا بے فائدہ ہے اس واسطے کہ انسانیت آج عمرانیات سے یہ امید باندھے بیٹھی ہے کہ وہ اس کی موجودہ تھیوں کو سلجھانے میں مدد دے گی تاکہ اس کی روشنی میں انسانی مستقبل کی تشکیل ہو سکے۔ ہمارے نزدیک آگت کونت کا یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں متضاد مسلک بقول لائبنز "اسی حد تک ٹھیک ہیں جہاں تک کہ وہ واقعات کی توثیق کرتے ہیں اور وہ دونوں اپنے منفیانہ پہلو کے اعتبار سے غلط ہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ ہمیں انسانی معاشروں کی ابتدائی حالت کی تحقیق کو اتنی ہی اہمیت دینی چاہیے جتنی کہ ان کی موجودہ حالت کو۔ مگر ہماری دانست میں انسانی معاشروں کی موجودہ حالت کی تحقیق اس لئے زیادہ مفید ہے کہ اس کے متعلق ہمارے پاس جو مسالاموجود ہے وہ نہایت نتیجہ خیز، پیچیدہ اور اعلیٰ قسم کا ہے۔ اور پھر سافٹ ہی یہ بھی ہے کہ موجودہ معاشروں سے ہمیں دلچسپی بھی زیادہ ہے۔ اور ان کے متعلق ہم مقابلہ زیادہ قابل وثوق معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس واسطے کہ زمانہ حال کے حقایق عمرانی کی تصدیق آسان ہے اور ماضی کی تو صرف ذہنی تعمیر ہی ممکن ہے اور خاص کر اسلئے اور بھی ہم موجودہ زمانہ کے معاشروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ آج کل کے لوگوں کے محرکات عمل اور انداز خیال تقریباً وہی ہیں جو ہمارے ہیں۔ برخلاف اس کے زمانہ ماضی اور بالخصوص ماضی بعید کے حقایق عمرانی کی چھان بین کے وقت ہمیں یہ کمی نہیں بخوٹنا چاہیے کہ اس زمانے کے انسانوں کی نفسی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوگی جو آج ہماری ہے۔ دراصل اس ساری بحث کا لب لباب یہی ہے کہ ماضی اور حال کے لوگوں کے نفسی رویہ کے فرق کو محسوس کیا جائے۔ خالص علمی نقطہ نظر سے موجودہ عہد کے بہتم باشان معاشروں کی تحقیق نہایت بصیرت افروز ہے۔ اس واسطے اور بھی کہ ہم باسانی ان کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

ساتواں باب

حقیقت اجتماعی کے خصائص اساسی | جیسا کہ ہم پچھلے بابوں میں بیان کر چکے ہیں، عمرانیات کی تحقیق کا مواد ذی روح ہستیوں کے باہمی تعلقات اور بالخصوص انسانوں کے باہمی تعلقات سے فراہم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اب اس کی ضرورت نہیں کہ اس اصول موضوعہ کی مزید تشریح کی جائے۔ یہیں چاہئے کہ ان تعلقات کی امتیازی خصوصیت اور ان کی اصلی حقیقت کا تجزیہ کر کے علیحدہ کر لیں۔

چنانچہ اس حقیقت کو دریافت کرنے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں اور انھیں کوششوں کی بدولت عمرانیات کے دو مسلک وجود میں آئے ہیں جو اب کم و بیش ایک چوتھائی صدی سے خالص کر کے فرانس میں مروج ہیں اور علمائے عمرانیات ان کی وجہ سے دو جماعتوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک مسلک کے بانی کبریل تارڈ ہوئے ہیں اور دوسرے کے ایٹل ورکیم۔ حقیقت اجتماعی کے متعلق ان دونوں مفکرین نے جو اظہار خیال کیا ہے اسے ہم اس جگہ مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ہم خود اپنی ذاتی رائے بھی ظاہر کر دیں گے۔ تارڈ کا نظریہ اس اصول پر مبنی ہے کہ معاشرہ صرف وہ ہستیاں

قایم کر سکتی ہیں جن میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مشترک زندگی کے لئے
 ضروری ہے کہ افراد جماعت میں یگانگت موجود ہو۔ یہی یگانگت
 اس جماعت کے لئے بنیاد ذریعہ اور مقصد کی حیثیت رکھتی ہے۔
 اور افراد میں اشتراک حیات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک
 کہ ان میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مماثلت نہ پائی جاتی ہو۔
 اشتراک حیات کے لئے یہ ضروری ہے کہ شروع ہی سے کسی
 جماعت کے افراد میں مماثلت موجود ہو جو آئندہ امتداد زمانہ سے
 تکمیل پذیر ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مماثلت
 کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ دراصل وہ ایک دوسرے کی نقل سے پیدا
 ہوتی ہے۔ وہ لوگ جن میں یگانگت پائی جاتی ہے ایک دوسرے
 کی باتوں کی نقل کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ نقل یک طرفہ ہوتی ہے
 یعنی یہ کہ ادنیٰ طبقہ اعلیٰ طبقہ کی نقل کرتا ہے پھر کچھ عرصے کے بعد
 دونوں طبقے ایک دوسرے کی نقل شروع کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اعلیٰ
 طبقہ کے لوگ بھی ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے کچھ نہ کچھ ضرور مستعار
 لیتے ہیں۔ شروع شروع میں نقل انسان کی خارجی اعمال کی آغوش
 نہیں کی جاتی جتنی کہ اس کی اندرونی زندگی کی۔ میرا مطلب اس
 سے یہ ہے کہ نقل کرنے والا بیشتر اس کے کہ وہ اپنے خیالات کو
 عملی جامہ پہنائے اپنے قابل تقلید نمونے کے نصب العین کو قبول
 کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ تار دن اس باہمی نقل کے قوانین
 کی اپنے نظریہ میں تشریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے
 کی نقل کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے افراد آپس میں بہت
 مشابہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بہت طرازی کرتا ہے تو اس
 کا اثر فوراً پوری جماعت کی زندگی میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ
 ہے کہ وہ باتیں جن کا تعلق انسان کی عقل اور اس کے مفاد سے ہے
 بہت جلد مشہور اور مقبول ہو جاتی ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو افراد کی ان

ہا ہے

جدت طرازیوں اور باہمی نقل کے قانون کو پیش نظر رکھ کر انسانیت کی پوری تاریخ سلوم کر لیں۔ تار د کا قول تھا کہ ”معاشرہ کی مثال اس کپڑے کی سی ہے جس کا تانا افراد کا باہمی نقل کرنا ہے اور باننا ان کی ایجادیں ہیں“

تار د نے اپنی سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب ”قوانین نقل“ میں مذکورہ بالا خیال کو نظریہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس نے بند میں ایک اور دوسری چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا نام ”قوانین اجتماعی“ ہے اس میں اس نے اپنے تصورات کو اختصار اور عمق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے طرز بیان میں غور و اسافر ہے۔ اس دوسری کتاب میں انسانی اعمال کی اس نے تین بڑی بڑی خصوصیات بتائی ہیں: تکرار، اختلاف اور تطابق۔ آگے چل کر وہ خود اپنے مفہوم کو اس طرح واضح کرتا ہے کہ معاشرتی زندگی میں تکرار اور نقل ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ عمل اختلاف دراصل عمل نقل کی ضد ہے۔ رہا عمل تطابق تو وہ بھی کم و بیش ایک طرح کی نقل ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ غرض کہ معاشرتی زندگی کی ان تینوں خصوصیتوں میں آپ کو عمل نقل ہی کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ دراصل ان دونوں کتابوں میں تار د کے بنیادی خیال کا جہاں تک تعلق ہے کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں شاید مطالب کو پیش کرنے کی ظاہری صورت میں غور و اسافر فرق ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تار د نے اپنے اس اعتقاد میں کبھی شبہ کو راہ نہیں دی کہ انسانوں کے باہمی تعلقات میں عمل نقل کو اساسی حیثیت حاصل رہی ہے۔

درکیم کا نظریہ اس سے مختلف تھا۔ لیکن ممکن ہے بادی النظر میں ان دونوں نظریوں کا فرق صاف نہ دکھائی دے۔ درکیم اپنے نظریہ کو ایک دوسری بنیاد پر استوار کرتا ہے۔ تار د جانتا تھا کہ اجتماعی تعلقات کی اصل روح کا سراغ لگائے۔ بہ خلاصہ اس کے درکیم

کے پیش نظر یہ بات تھی کہ وہ اجتماعی تعلقات کی خارجی خصوصیات یا بے معلوم کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ایسے خارجی معیار کا پتہ چل جائے جس کی گسوٹی پر وہ اجتماعی مظاہر اور خالص انفرادی مظاہر کو پرکھ سکے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ معیار اجتماعی ”جبر“ ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک ہر اس حقیقت کو عمرانی حیثیت حاصل ہے جو معاشرہ کے جبر سے ظہور پذیر ہو۔ پھر وہ یہ بتاتا ہے کہ ہم اپنے معتقدات اور اپنے طرز عمل کو اپنے آپ نہیں مقرر کرتے بلکہ وہ ہمارے لئے پہلے سے ہمارے گرد و پیش میں موجود ہوتے ہیں۔ ہمیں تو فی الواقع اتنا اختیار بھی نہیں ہے کہ کسی دوسری قسم کے معتقدات یا طرز عمل کو قبول کریں۔ اس واسطے کہ ایسا کرنے سے ہم اپنے معاشرہ کے حلقہ سے خارج کر دیئے جائیں گے۔ مذہب، قانون اور رسم و رواج اس اجتماعی جبر کی مختلف شکلیں ہیں جو معاشرہ کی طرف سے ہم پر عاید کی جاتی ہیں۔ اسی جبر کا اثر ہمارے سارے چلن و حرکت پر ہوتا ہے اور ایسا ہونا اچھا بھی ہے اس واسطے کہ اسی کی بدولت ہم میں اور ہمارے دوسرے ہم جنسوں کے درمیان ایک ربط قائم ہو جاتا ہے اور ہم ان کے اعمال سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ بقول پاسکال ”ہماری اس غلامی ہی میں ہماری فضیلت مضمر ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کے ماہرین عمرانیات کے نزدیک شہر (مدن) کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اگلے زمانہ کے معتقدین کے ہاں خدا کو حاصل تھا۔ مدن کے بغیر نفس انفرادی کی ماہیت جاننا محال ہے بلکہ یوں کہیے کہ اسے تصویر ہی میں لانا ناممکن ہے۔

یقیناً یہ دونوں مذکورہ بالا نظر ایسے ایک دوسرے کی ضد ہیں تاہم ان کے ہاں حقیقت اجتماعی عبارت سے فرد کی اس کوشش سے جو وہ کسی نمونہ کو سامنے رکھ کر اس سے موافقت پیدا کرنے کے لئے کرتا ہے۔ درحکم کے نزدیک حقیقت اجتماعی جماعت کے اس

باب

جبر کا نتیجہ ہے جو وہ اپنے عناصر ترکیبی پر روا رکھتی ہے۔ اگلے باب میں ہم اس اختلاف کے گہرے اسباب کی تحقیق کریں گے۔ اس وقت ہم صرف آپ کی توجہ اس مشابہت کی جانب متبدل کرنا چاہتے ہیں جو ان دونوں مصنفوں کے خیالات میں پائی جاتی ہے۔ اور جس کے متعلق عام طور پر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ اصل میں دونوں یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اجتماعی اور انفرادی حقیقت میں کیونکر فرق کیا جائے۔ تارد کے خیال کے مطابق نقل کا تعلق اجتماعی حقیقت سے ہے اور ایجاد کا انفرادی حقیقت سے۔ ڈرکیم کہتا ہے کہ اجتماعی حقیقت عبارت ہے اُس ضابطہ اعمال سے جو اجماعت فرد پر عاید کرتی ہے۔ اور انفرادی حقیقت سے وہ طرز عمل مراد ہے جو جماعت فرد کی ذاتی ایج اور اختیار پر چھوڑ دیتی ہے۔ غرض کہ آپ نے دیکھا کہ یہ دونوں مفکر انسانی اعمال کے اجتماعی اور انفرادی عناصر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چاہے وہ مختلف معیاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی کیوں نہ ہو۔

ہم اپنی ذاتی رائے کا یہ کہنا میں ان ہر دو مذکورہ بالا نظریوں سے بعض جگہ اختلاف ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں نظریوں کا اختلاف سچا ہے خود اس رائے کی جانب ہماری رہبری کرتا ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ غیر مکمل ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی حیل پر کبھی نقل کا اثر ہوتا ہے اور کبھی وہ ایک منظر راستہ پر اس لئے پڑ جاتا ہے کہ اجتماعی جبر کے ہاتھوں وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ پہلی صورت میں تارد کا خیال درست ہے اور دوسری صورت میں ڈرکیم کی رائے ٹھیک ہے۔ فی الحقیقت ان دونوں مفکروں کے اصول موضوعہ پوری حقیقت پر حاوی نہیں کیے جاسکتے۔ اس واسطے کہ ایسے انسانی اعمال کی بھی تصدیق کی گئی ہے جو نہ ایک کے اصول کے ماتحت آتے ہیں اور نہ دوسرے کے۔ مثال کے طور پر آپ

ان افراد کے اعمال کو لیجئے جو زمان و مکان کے بعد کے باوجود بالکل بائے ایک ہی طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کی دراصل وجہ طبیعی اور نامی عناصر کی یکسانیت ہوتی ہے نہ کہ نقل و اجتماعی جبر کا اثر۔

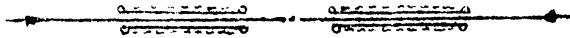
دوسری بات جس کی ہمیں تحقیق کرنا ہے یہ ہے کہ تار و اور درکیم دونوں اجتماعی اور انفرادی حقیقت کا جو فرق بتاتے ہیں آیا واقعی اس کی وہی اہمیت ہے جیسا کہ ان کا خیال ہے؟ بلاشبہ تحقیق کی سہولت کی غرض سے اس فرق کو اجاگر کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر دراصل اس فرق کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اجتماعی زندگی میں انفرادی عناصر کا اثر موجود ہوتا ہے اور اسی طرح سے انفرادی زندگی میں اجتماعی عناصر کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ دراصل انفرادی اور اجتماعی زندگی جہاں ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں اس کا تعین بہت دشوار ہے۔ گزرتا تار و کی لطافت طبع سے غالباً یہ نازک نکتہ پوشیدہ نہ رہا ہوگا۔ لیکن ہم اس نکتہ کو ذرا اچھی طرح سے واضح کریں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہر نقلی میں کچھ نہ کچھ ذاتی ایچ کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ آپ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی نمونے کی نقل بغیر اصلیت کو اپنی خواہش کے مطابق تھوڑا بہت بگاڑے ہوئے کر سکیں۔ چنانچہ نقل میں بھی ایجاد کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر موجود کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سالے سے استفادہ کرے جو پہلے سے موجود ہے اور اس راستے پر چلے جس پر اسکے پیشرو چل چکے ہیں چنانچہ کوئی ایجاد ایسی نہیں ملے گی جس میں تھوڑا بہت نقل کا عنصر نہ پایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس حقیقت کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اگرچہ افراد کے اعمال اجتماعی ضابطوں کے تابع ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی خصوصیات، وسائل اور ان کی ذاتی خواہشوں کو ان اعمال میں بڑا دخل حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر انفرادی عمل کے ڈانڈے آپ کو اجتماعی ضابطوں سے ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ فی الواقع اجتماعی اور انفرادی عناصر حیات آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ انھیں

باب

جد اکرا نڈوار ہے ۔ غرضکہ فرد اور جماعت کو ایک دوسرے کی ضد قرار دینا درست نہیں ۔

ہمارے اس نتیجہ کا قدرتی طور پر یہ اثر ہوگا کہ حیات اجتماعی کی تعریف کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائیگی ۔ اور اس کے لئے فرد سے علیحدہ کسی نئے معیار کے قایم کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ لیکن فی الحقیقت ہمارا مطلب یہ تھا کہ کسی طرح سے حقیقت اجتماعی کی ایسی وسیع تعریف کی جائے جو اپنے سب عناصر پر پورے طور پر حاوی ہو ۔ چنانچہ ہمارے خیال میں حقیقت اجتماعی سے وہ اعمال مراد ہیں جو متعدد افراد کے باہمی تعاون سے وجود میں آئیں ۔ اس تعاون کے لئے یہ ضروری نہیں کہ افراد کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہو ۔ اس سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ کوئی انسانی عمل ایک دوسرے کی مدد اور شرکت سے کیا جائے ۔ دو یا دو سے زائد اشخاص جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں ، یا کسی مسئلہ کے متعلق غور کرتے ہیں ، یا متحد ہو کر عمل کرتے ہیں ، تو ایسی حالت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے عمل کی نوعیت اجتماعی ہے ۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ باوجود اختلافات کے بھی یہ تعاون عمل باقی رہ سکتا ہے ۔ اس واسطے کہ باوجود اختلافات کے بمقابلہ دوسروں کے انہیں بعض مسائل کی نسبت اشتراک ارادہ پایا جاتا ہے ۔ ہم افراد کے تعاون عمل کو اس وقت تک تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں جب تک کہ ان سمجھوں کی ایک متحدہ شخصیت رہے ۔ لیکن اگر ان کے اعمال کسی بیرونی اثر کے تابع ہو گئے ہیں تو ایسی حالت میں تعاون عمل بھی مفقود ہو جائے گا ۔ غرضکہ ہمارے خیال میں تو اصلی اجتماعی حقیقت مفہوم ہے افراد کے نفسی اتحاد میں ۔ ہیں اعتراف ہے کہ ہم نے اس وقت جو اصطلاحیں استعمال کیں وہ بہت زیادہ واضح نہیں ہیں ان کی غرض صرف اتنی ہے کہ بعض حقائق کی اس وقت تصدیق کی جائے ۔ ہم نے ان اصطلاحوں کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ

حقایق کی کاٹ چھانٹ کر کے ان کی صورت کو مسخ کر دیں۔ ایسے علم کی تعریف کرنا دراصل بہت دشوار ہے جس کا ابھی ابتدائی حالت میں احساس ہو رہا ہو۔ نیز یہ کہ اس تعریف سے معروف خدا و خصال پیش کئے جائیں۔ لیکن کیا کیجئے منطق کو اس وقت تک اطمینان نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کل پر حاوی نہ ہو جائے اس واسطے کہ وہ کل ہی پر چسپاں ہو سکتی ہے۔



اکھواں باب

معاشرہ کی حقیقی ماہیت | ہم نے پچھلے باب میں تار د اور درکیم کے جس نظری اختلاف کا ذکر کیا وہ پچیس سال قبل انہی واجبی حدود سے زیادہ آگے بڑھ گیا تھا۔ علمی حلقوں میں اس کے متعلق خوب پرچوش بحثیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ اسی اختلاف کی وجہ سے فرانس کے اہل علم دو ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ دراصل تار د اور درکیم کے نظریوں کی تہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ فلسفہ اجتماعی کے دو ایسے اصول کار فرما ہیں جو مدتوں سے ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان اصول سے قدرتی طور پر اجتماعی چلن کے جو دو عقاید پیدا ہوتے ہیں وہ صد ہا سال سے برسرِ پیکار رہ چکے ہیں۔ فی الحقیقت تار د انفرادیت پسند تھا۔ اجتماعی زندگی میں اسے ہر کہیں بس یہی نظر آتا تھا کہ بالعموم لوگ اپنے ہم جنسوں کی نقل کرتے ہیں اور کبھی کبھی خود اپنی ذاتی اتباع سے بھی کچھ ایجاد کر لیتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس درکیم کا عقیدہ تھا کہ جماعت ہر کہیں فرد پر اپنا نقش ثبت کر دیتی ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کی ”اشتمالی“ قسم کی تاویل کرتا تھا۔ ہم یہاں لفظ ”اشتمالی“ کو سیاسی معنوں میں

نہیں بلکہ خالص علمی معنوں میں استعمال کر رہے ہیں دراصل لفظ "انفرادیت" بابت اور لفظ "اشتمالی" ہمارے علمی مسئلہ کے اس تعلق کو بخوبی واضح کر دیتے ہیں جو اسے علمی دنیا کے ساتھ قائم رکھنا پڑتا ہے۔ علمی نقطہ نظر سے "انفرادی" کا لفظ ان اشخاص پر عاید ہوتا ہے جو فرد کے حلقہ عمل کو وسیع کرنے کا قایل ہو۔ اور لفظ "اشتمالی" ان پر عاید ہوتا ہے جو جماعت کو اس کے عناصر پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو لوگ انفرادیت کے قایل ہوتے ہیں۔ وہ ساتھ ہی حریت کے بھی علمبردار ہوتے ہیں اور وہ جو اشتمالیت کی طرف رجحان رکھتے ہیں انسانی مساوات کے حامی ہوتے ہیں۔ بلاشبہ مسائل کی علمی اور علمی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل جدا لگانے ہوتی ہے۔ یہ صورت ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک کے متعلق اپنی قطعی رائے رکھتا ہو اور دوسرے کی نسبت اس کی کوئی رائے نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کی نسبت جو ردیہ اختیار کیا جاتا ہے وہ اس سے مختلف ہو جو دوسرے کی نسبت اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن بہر حال اس کا قوی امکان ہے کہ ایک کے لئے جو حل تسلیم کیا گیا ہے وہ دوسرے کے لئے بھی تسلیم کیا جائے۔ منطقی اعتبار سے کسی مسئلہ کی علمی نوعیت کا اس کی علمی نوعیت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر اوقات علمی ضروریات کا رنگ علمی مسئلہ کے حل پر غالب آ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تاردار درکیم کے اختلاف کو جو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کے مختلف رجحانوں کے ساتھ لوگوں نے خود اپنی ذاتی اغراض کو وابستہ کر لیا تھا۔ اسی واسطے تو اہل علم کی جماعت میں اختلاف اس قدر بڑھ گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس بحث کو اس قدر طول دینے کی ذمہ داری ان دونوں مفکرین پر بہرگز نہیں عاید ہوتی۔ دراصل ان دونوں میں کوئی بھی مسائل کی علمی نوعیت کو اہمیت دینے کا قائل نہ تھا اور خصوصاً درکیم نے

باب

تو اس باب میں ہمیشہ بڑی احتیاط سے کام لیا اور کبھی علمی مسائل کے قریب بھی نہیں بھٹکا۔ چنانچہ اور تحریکوں کی طرح یہاں بھی یہی ہوا کہ قاعدین ان تحریکوں کو وجود میں لانے پر قادر ہوتے ہیں لیکن انھیں روکنا ان کے بس کی بات نہیں۔

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو دراصل اجتماعی زندگی کی تحقیق کی جان ہے، وہ سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے اعمال میں تصور انفرادی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا تصور اجتماعی کو؟ جسے فلسفہ میں درک ہے وہ اس قسم کے ترجیح دینے ہی کو تعصب سے تعبیر کرے گا۔ اس واسطے کہ پیشتر اس کے کہ ان دونوں میں کسی کو ترجیح دی جائے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ آیا جماعت اپنا علیحدہ وجود رکھتی بھی ہے یا نہیں، اور اگر وہ وجود رکھتی ہے تو اس کی کیا نوعیت ہے؟ - ظاہر ہے کہ افراد کا مستقل وجود اس قدر بن حقیقت ہے کہ اس کے متعلق شبہ کی گنجائش ہی نہیں مگر جماعتیں جو افراد پر مشتمل ہوتی ہیں ان کی حالت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ اول تو اس بات کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ آیا ہم ان جماعتوں کو حقیقی وجود سے تعبیر کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ آیا ان کی قدر و قیمت کا افراد کی قدر و قیمت سے مقابلہ کر کے ان کے باہمی فرق کو ظاہر کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

ہماری رائے میں اس گتھی کو سلجھانے کی یہ صورت ممکن ہے کہ ہم جماعت کی حقیقت کو تو تسلیم کر لیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ہم اسے افراد سے علیحدہ ایک مستقل وجود تصور کریں۔ اس طریقہ سے ہم اپنے تئیں دونوں انتہا پسند نظریوں کے حامیوں کے زمرہ سے جدا کر لیتے ہیں۔ خالص انفرادیت کے علمبرداروں سے ہماری یہ عرض ہے کہ الگ الگ افراد کی ہستیوں کے علاوہ اور کسی وجود سے یکسر انکار کرنا سخت غلطی ہے اور اشتہالیوں سے

ہمارا کہنا یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا جو ایک نیا بہت کم نے بنا کر کھڑا کیا ہے، اسے انسانوں سے علیحدہ اور بالاتر سمجھنا کہاں کی دانائی ہے؟ ان دونوں مسائل کے متعلق ہم ذیل میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔

پہلے تو جماعت کے وجود کی تائید میں جب دعویٰ پیش کیا جائے تو ٹھیک ٹھیک اس امر کی تصریح کر دینی چاہیے کہ جماعت سے ہماری کیا مراد ہے؟ عالم نباتات و حیوانات میں نوعی زندگی کی حقیقت تسلیم کی گئی ہے۔ بادی النظر میں بنی نوع کو دوسرے حیوانات کے ساتھ مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بعض بڑے بڑے مفکر تک اس خیال کی تائید کر چکے ہیں۔ پاسکال کا قول مشہور ہے کہ ”انسانیت بمنزلہ ایک فرد کے ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہمیشہ سیکھتا رہے گا۔“ آگت کو نت نے انسانیت کو ”ہستی عظمیٰ“ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق افراد کو چاہیے کہ انسانیت کو بمنزلہ ”مدبر عالم ناسوت“ سمجھیں۔ آج بہ وسیع تصور ہیں کہ قدر عام معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اتحاد انسانیت ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ خواب نسلی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے ابھی تک محتاج تعبیر رہا ہے۔ ماہر عمرانیات انسانیت کو الگ الگ عناصر کی صورت میں دیکھتا ہے اور اکثر اوقات وہ ان عناصر کو ایک دوسرے کی ضد پاتا ہے۔ انسانیت کے ان اجزاء کا وجود مختلف اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے جن کی نسبت ہم آگے چلکر تفصیل سے ذکر کریں گے۔ ان میں جنھیں اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہیں: نسل، زبان، مذہب اور قومیت۔ اس وقت ہم آخر الذکر سے بحث کریں گے۔ اقوام کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے شدت سے کوشاں رہتی ہیں۔ چنانچہ ان سب کو عمرانیات میں وہی اہمیت حاصل ہے جو علم حیاتیات میں انواع ذی روح

باب

کو حاصل ہوتی ہے اس علم نے انواع کی بہت بڑی تعداد گنائی ہے اور اقوام کی تعداد مقابلہ کم ہے۔ ہم صحت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ قوم کا اجتماعی تصور حیاتیات کے نوعی تصور سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ چنانچہ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نئی نوع انسان کو ایک کل سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ ہاں ہر قوم میں علیحدہ علیحدہ آب کو اس کل کی شبیہ نظر آتی ہے۔ قومی کردہ بندی کو ایک وحدت اور ایک حقیقت اجتماعی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کئی پہلوؤں سے اقوام اور افراد کے درمیان ایک طرح کی مشابہت نظر آتی ہے۔ چنانچہ فرد کی طرح ہر قوم کا بھی ایک نام ہوتا ہے، اس کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور اس کی مخصوص نفسی اور مادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر قوم کی ایک علیحدہ ریاست بھی ہوتی ہے اور اس ریاست میں ایک حکومت کارفرما ہوتی ہے۔ یہ حکومت دراصل ریاست کی ظاہری نمائندگی کرتی ہے۔ بین الاقوامی قانون ہر قوم کی اخلاقی شخصیت کو تسلیم کرتا ہے۔ قوم اور اس کے عناصر یعنی افراد کے باہمی تعلق میں دو باتیں بینا طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قوم فرد کی تشکیل کرتی ہے۔ اسے اپنی زبان، اپنے خیالات اور اپنی رسوم سے آشنا کرتی ہے۔ اور تقیم کار کے اصول کے مطابق جماعتی زندگی میں اس کی جگہ مقرر کرتی ہے۔ قوم ہی کی بدولت فرد کی روزی کا سامان ہوتا ہے اور اس کے عمل کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ افراد مٹ جاتے ہیں مگر قوم باقی رہتی ہے۔ اس کی عمر افراد کی عمر سے زیادہ ہوتی ہے۔ فرد کی عمر زیادہ سے زیادہ ہوئی تو سو برس مگر اقوام ہزاروں سال تک زندہ رہتی ہیں۔ جس طرح فرد کی زندگی میں پرانے خیلے فنا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خیلوں سے تجدید حیات

ہوتی رہتی ہے اسی طرح اقوام کی زندگی میں بھی بوڑھے لوگ بائٹ مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نوجوانوں سے پُر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اقوام آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ افراد کی طرح پیش آتی ہیں۔ جنگ کے موقع پر یہی اقوام مسلح ہانتی کا ہستی نظر آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے منہ سے مارے غصے کے جھاگ نکل رہے ہیں۔ اس موقع پر قوم کے سارے افراد کی حیثیت بہنزلہ ایک وجود کے ہو جاتی ہے۔ مشترک دشمن کے خلاف سب کے دلوں میں ایک ہی قسم کی امنگ موجود ہوتی ہے اور سبھوں کے دلوں میں ایک ہی طرح کی غلش پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض کہ پوری قوم کے جسم میں ایک ہی روح کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ ایسے المناک مواقع پر فرد قوم کی خاطر اپنا وقت، اپنے مشاغل، اور اپنی جان تک قربان کرنے میں پس دیش نہیں کرتا۔ اس کی جنگ میں شرکت اپنی ذاتی اغراض، اپنے گھر بار یا کسی اپنے محبوب عزیز کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف اپنے وطن کی خاطر جان جو کھوں میں ڈالتا ہے۔ وہ سب کچھ بلا کسی امتیاز کے اپنے وطن کے لئے کرتا ہے۔ اگر وطن کی اعلیٰ حقیقت نے اس کے دل میں جگہ نہ کر لی ہوتی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ سچ دے۔

ہم نے یہ جو واقعات بیان کئے ہیں حقائق پر مبنی ہیں۔ انہیں جیسا چاہئے ویسے نہ سمجھنا یا ان کی طرف سے شیم پوشی کرنا نادانی ہوگی۔ اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی جانب ہمیں توجہ کرنی چاہئے۔ دراصل سارے انسانی معاملوں کی یہ کیفیت ہے کہ آپ انہیں مختلف پہلوؤں سے دیکھ سکتے ہیں جس طرح ہر کپڑے اور تہنہ کا الٹا سیدھا ہوا کرتا ہے اسی طرح سارے انسانی اعمال کے بھی جن میں معاشرہ کو سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھنا

باب

چاہئے، دورِ رخ ہو کر تے ہیں۔ اور باوجود اختلاف کے ان دونوں
 رخنوں میں ایک طرح کا تعلق موجود ہوتا ہے۔ دراصل یہ دونوں
 پہلو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی
 کافی بالذات نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہیگل نے ثابت
 کیا ہے کہ متضاد اشیا میں مماثلت موجود ہوتی ہے۔ ہم شاید اپنے
 دعویٰ کو اتنا زیادہ بڑھا کر تو نہیں بیان کریں گے مگر ہاں، ہم بھی متضاد
 اشیا میں ایک طرح کے ربط کے ضرور قائل ہیں۔ چنانچہ ہم نے
 ابھی ابھی حقیقت اجتماعی کی نسبت جو ذکر کیا تو اس میں بھی اسی طرح
 ہیں کوئی ایسی چیز نہیں نظر آتی جس کی بناء پر ہم اسے اور فرد کو
 ایک دوسرے سے علیحدہ، آزاد وجود تسلیم کریں۔ بعینہ ہی حال
 ریاست کا ہے۔ ریاست کوئی پُر اسرار ہستی نہیں ہے جیسا کہ بعض
 المانی مصنفین نے اسے پیش کیا ہے۔ ان مصنفین کے ہاں حقائق
 کی صحت کا زیادہ التزام نہیں برتا گیا۔ چنانچہ انھوں نے ریاست
 کو افراد سے ماورئی تسلیم کیا ہے یہاں تک کہ وہ ان کے تعاون
 عمل سے بھی بے نیاز ہے۔ مگر فرانسیسی ذہن کی شفاف روشنی کے
 سامنے اس قسم کی تاریک خیال آرائیاں زیادہ عرصہ تک نہیں
 ٹھہر سکتیں۔ یہاں ہم آپ کو ان تصورات کے نتائج سے آگاہ
 کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس واسطے کہ درحکم کی بعض اصطلاحوں
 کے ہمارے ملک میں رائج ہونے سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے
 کہ ہمارے ہاں بھی اس قسم کے تصورات کو قبول کر لیا گیا۔ یہ
 بات پورے طور پر ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ معاشرہ کا افراد
 سے ماورائی کوئی وجود نہیں۔ دراصل جسم اجتماعی کا جب ذکر کیا
 جاتا ہے تو اس سے صرف شہریوں کی مجموعی حالت مراد ہوتی
 ہے۔ جب نفس اجتماعی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے افراد کی
 وہ ذہنی حالت مراد ہوتی ہے جس سے ان کے خیالات و

جذبات میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ جماعت دراصل عبارت ہوتی ہے جماعت کے ارکان سے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ جماعتی زندگی کا مقصد افراد کی زندگی سے علاحدہ نہیں ہو سکتا۔ جب یہ دعویٰ پیش کیا جاتا ہے کہ شہری کو ریاست کیلئے جینا چاہئے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اسے اپنے ہم جنسوں کے لئے کام کرنا چاہئے اور یہ کہ ہر فرد بشر کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی تابع داری کرے۔ پہلا خیال ممکن ہے اخلاقی حیثیت سے بہت اچھا ہو مگر اس وقت اسے عمل میں لانا ممکن نہ ہوگا جب تک کہ اس میں اصولی تبدیلی نہ کر لی جائے۔ ممکن ہے دوسرا خیال ان ممالک میں مقبول ہو جائے۔ جہاں شاہی طرز حکومت رائج ہے اور بادشاہ کو وطنیت کے اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جن ملکوں میں جمہوریت کی فرمان روائی ہے۔ وہاں اس کے بالکل برعکس حکومتوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے محکموں کی خدمت کریں۔ اس واسطے کہ جمہوری اصول کے مطابق حکومت افراد کی بعض ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آتی ہے۔ جمہوری حکومتوں میں حکمرانوں کو جو مراعات حاصل ہوتی ہیں ان کے حدود عام شہریوں کے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے متعین کر دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرد کے حقوق ہمیشہ ریاست اور حکومت کے حقوق کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ یہ حقوق آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہوئے ہیں جیسے کسی ایک شے کے دو رخ۔ ان سے تمدنی زندگی کا توازن برقرار رہتا ہے اور دراصل ان کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یہ حقوق خود حقیقت اجتماعی کا پر تو ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض وقت ان میں تضاد واقع ہو جائے مگر وہ رہتے ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد اور

باب

جماعت مثل اُن حقائق کے ہیں جو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جاسکتے ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ جماعت کو محض تجربہ سے تعبیر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے وجود کا افراد کے وجود پر تامل نہ دار ہوتا ہے۔ اب ان دونوں دعوؤں کی صداقت کی جانچ باقی ہے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ ہم اس امر کو تسلیم کریں کہ حیات اجتماعی فی الحقیقت افراد کی تنظیم کا دوسرا نام ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس تنظیم سے بجائے خود حیات انفرادی کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم فرد اور جماعت کے حقائق پر اس نقطہ نظر سے غور کریں تو اکثر متضاد خیالات میں موافقت کی شکل نکل سکتی ہے ممکن ہے کہ ہمیں اس بقوہ کو صحت سے پیش کرنے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ آئندہ ابواب میں ہم یہی کریں گے۔



نواں باب

معاہدہ عمرانی یا جسم اجتماعی | اب سوال یہ ہے کہ ہم جماعت کو افراد کی نظر سے کیونکر تعبیر کر سکتے ہیں ؟ اس سوال کے

بہت سارے جواب دیئے جا چکے ہیں۔ اس باب میں خاص طور پر دو خیال بہت مقبول ہوئے۔ ان دونوں سے وہ نظام مراد ہیں جن کے لئے ”نظریہ معاہدہ عمرانی“ اور ”نظریہ جسم اجتماعی“ کی اصطلاحیں متعارف ہیں۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ ان دونوں نظریوں میں مفاد بہت پیدا کی جاسکتی ہے۔

”نظریہ معاہدہ عمرانی“ جب پہلے پہل پیش کیا گیا تو واقعی پہلے کے نظریوں کے بہ نسبت اس میں زیادہ وسعت نظر آتی تھی۔ اس نظریہ کے وجود میں آنے سے قبل اجتماعی زندگی کے متعلق جو خیالات رائج تھے وہ سب کے سب اصولاً ربط عمرانی کو اقتدار و تحکم کے تابع قرار دیتے تھے۔ اور اس اقتدار کا تصور یہ تھا کہ وہ مادی قوت اور وراثت پر مبنی ہوتا ہے یا عالم محسوسات سے بالاتر مشیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ”نظریہ معاہدہ عمرانی“ نے یہ ثابت کر دیا کہ افراد کے باہمی ربط و تعلق میں ان کے ارادے کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ اس نظریہ سے حیات عمرانی

باب

افراد کے باہمی تعاون عمل کا نتیجہ قرار پائی جسے انھوں نے خود اپنی مرضی سے نہ کہ کسی کے جبر سے اختیار کیا۔ چنانچہ اس نظریہ نے اپنی ابتدا ہی فرد انسانی کی آزادی کے اصول سے کی اور اس کے مطابق حیات اجتماعی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ اس کی آزادی کو برقرار و مستحکم کرے۔ سب سے پہلے اس نظریہ کو مختصر طور پر اسپینوزا نے پیش کیا تھا پھر اس کے بعد دوستو کی خطابت نے اس کی حمایت میں اپنا سارا زور صرف کیا۔ کانٹ کے ہاں بھی یہ نظریہ آب کو ملے گا۔ پھر اسی نظریہ کی تعلیم کے اثر سے انسان اور شہر کی حقوق کا تہا بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کیا گیا۔ فرانس کی جہوریت کا دستور اساسی اور موجودہ لیبرل ازم کی تحریک اسی نظریہ پر مبنی ہیں۔

عملی اصول کی حیثیت سے اس نظریہ میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن تاریخی تاویل کے اعتبار سے اسے ٹھیک نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ جس زمانہ میں اس نظریہ کو منظر عام پر لا یا گیا اس زمانہ میں تاریخی صحت کا التزام ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خود دوستو نے اسے محض اصول موضوعہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اپنی کتاب ”معاہدہ عمرانی“ کے پہلے باب میں یہ بات بطور مفروضہ بیان کی ہے کہ انسانیت کی تاریخ میں ایک عہد ایسا بھی گزرے گا جب کہ انسان ”فطری حالت“ میں زندگی بسر کرتا تھا اور سب لوگ ایک دوسرے سے الگ تھلک رہا کرتے تھے۔ خود دوستو کو اپنے اس دعوے کی صداقت پر پوری طرح اعتماد نہ تھا۔ آج ہمارے زمانہ میں شاید ہی کوئی ہو جو اس فہم کے نظریے کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ ہمارے زمانہ میں اس دعوے کو بے بنیاد قرار دیا جائے گا کہ انسانوں پر ایک ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے کہ جب کہ وہ حیات اجتماعی سے نا آشنا

تھے۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ غالباً شاید ہی کبھی لوگوں نے اس بارے
 دعوے کو تسلیم کیا ہو۔ ہمارے زمانہ میں تو معاشرہ کو اصل
 حقیقت خیال کیا جاتا ہے نہ کہ حقیقت ماخوذ۔
 چنانچہ آج کل جو نظریہ بہت مقبول ہے وہ مذکورہ بالا
 اصول پر مبنی ہے۔ اسے ”نظریہ جسم اجتماعی“ کہتے ہیں۔ دراصل
 یہ نظریہ بہت قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔ قدما کے ہاں
 اور ازمنہ وسطیٰ میں انہیں اس کے متعلق ذکر ملتا ہے۔ انیسویں صدی
 عیسوی میں یہ نظریہ باقاعدہ علمی شکل میں پیش کیا گیا۔ آگست کونت
 کے ہاں بھی ہمیں ”اجتماعی جسم نامی“ کے خیال کا ذکر ملتا ہے۔
 ہاں، اس نے اس اصطلاح کو اپنے مخصوص معنی میں استعمال
 کیا ہے۔ ہر برٹ اسپنسر لفظی چکر سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس
 نے اپنی کتاب ”اصول عمرانیات“ میں اس نظریہ پر بحث
 کی ہے۔ اور اس کے خیالات کا چرچہ اور دوسرے ملکوں کے
 علمائے عمرانیات نے اتارا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں پڑوسی
 علمائے عمرانیات ٹراک نووی کو اور پال دے لین فیاض
 طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر مشہور المانی مصنف البرٹ شامفل نے
 اس نظریہ کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب

۱۔ دیکھو لوگ اسٹین کی کتاب ”ریاست کے میکاکی اور نامی تصورات“ نیز دیکھو
 ۲۔ ”عمرانیات کا بین الاقوامی رسالہ“۔

۳۔ دیکھو ”نظام سیاست ایجابی“ جلد ۲۔ باب ۵۔

۴۔ دیکھو اس کی کتاب ”دفعہ انسانی اور ارادۂ اجتماعی“۔

۵۔ مستقبل کے علم عمرانی پر چند خیالات“ روسی اور جرمن زبان میں شائع ہو چکی
 ہیں اور ”امراض اجتماعی کی تشخیص“ فرانسیسی میں شائع ہوئی ہے۔

ایک

کی تمہید ہی میں اس کی تصریح کر دی ہے کہ معاشرہ مثل ایک تنظیم کے ہے نہ کہ بہ منزلہ عضو نامی۔ فرانس میں اجتماعی جسم نامی کے نظریئے کو اس لئے خوب فروغ نصیب ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ اور اس کی تہ میں اجتماعی ذمہ داری کا خیال مقبول ہو چکا تھا۔ آج ہمارے زمانہ میں بھی یہ دونوں تصورات ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ انھیں جدا کرنا بہت دشوار ہے۔ بظاہر اس کی کوئی منطقی وجہ نہیں نظر آتی مگر بہر حال یہ ایک امر واقعہ ہے۔ اس نظریہ کے متبعین کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کی تاریخ میں کبھی ایسا کوئی دن نہیں آیا جب کہ خاکسار کے لوگوں نے تشکیل اجتماعی پر غور کیا ہو۔ بلکہ اجتماعی زندگی سے انسان ہمیشہ سے واقف ہے۔ ارسطو کے مشہور مقولہ کے موافق انسان ایک جماعت پسند حیوان ہے۔ معاشرہ انسان کا ہمیشہ سے فطری ماحول رہا ہے۔ اور اس نے قدیم سے اسی ماحول میں اپنی زندگی بسر کی جسم اجتماعی میں انسان کی حیثیت بمنزلہ ایک خلیہ کے ہے۔ اجتماعی جسم میں افراد کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو کسی شخص کے جسم میں جاندار خلیوں کی ہوتی ہے۔ جسم اجتماعی کے خلیے بھی بڑھ کر رگ و پے اور اعضاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انفرادی جسم کی طرح اجتماعی جسم میں بھی یہ صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ خوراک کو جزو بدن بنائے، تخلیق حیات کرے، اور ربط و تعلق کی زندگی بسر کرے۔ جسم اجتماعی تطابق، توازن اور انتخاب اصلاح کے اصول پر بھی عمل کرتا ہے۔ انفرادی جسم کے مثل اجتماعی جسم کو بھی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں وہ بھی جو کھوں سے گزرتے ہیں اور انھیں بھی پیدائش، بچپن،

جوانی اور بھڑوال و موت کے مختلف دوروں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جس طرح مجموعی طور پر فرد و جماعت میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے اسی طرح ان کے عناصر مشتملہ میں بھی مشابہت موجود ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جسم انفرادی اور جسم اجتماعی کی اس باہمی مشابہت کے متعلق خود ہمارا کیا خیال ہے۔ یہ سچ ہے کہ بنظر بعض باتوں میں یہ مشابہت اس قدر صریح ہے کہ اس کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مثال کے طور پر تقسیم کار کے اصول کو لیجئے۔ اس اصول کی کار فرمائی آپ کو جاندار جسم کے مختلف حصوں میں اسی طرح نظر آئے گی جس طرح معاشرہ میں اسی اصول پر عمل پیرا ہونے کے باعث جسم انفرادی کے وظائف میں تبادلہ خدمات اور تعاون کی صورت پیدا ہوتی ہے اور مختلف حصوں کے اسی باہمی تعاون و تعامل کی بدولت ایک جسم ناگزیر وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہی تبادلہ خدمات اور تعاون معاشرہ کی اجتماعی زندگی میں ارادی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس انسانی ارادہ اور فکر کی بنیاد پر اخلاق کی عمارت استوار کی جاتی ہے۔ فرد اور جماعت کی اس عام مشابہت کے علاوہ بعض باتوں میں یہ مشابہت بہت ہی نمایاں ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے بعض واقعات حیات نامی کے بعض مظاہر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ مثلاً معاشرہ میں تقسیم دولت اور انسانی جسم کے دوران خون میں مشابہت ملتی ہے۔ اسپر کو یہاں تک کہتا ہے کہ جسم کے اعصاب اور برقی تاروں میں بھی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ مشابہت چاہے کتنی ہی بین کیوں نہ ہو مگر ہمارے خیال میں یہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں زیادہ قدم آگے نہ بڑھایا جائے۔

باب ۹

اس لئے کہ اگر یہاں ہم نہ ر کے تو یہ علمی مشابہت محض ایک استعارہ ہو کر رہ جائے۔

اس بحث میں ہم اس عام نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اجتماعی طریق عمل کی بنا اور اس کا نمونہ ایک حد تک ہمیں حیات نامی میں ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعلق بہت دور کا ہو۔ معاشرے بھی اجسام نامی کے مثل جاندار فطرت کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ دونوں پر ایک ہی نوعیت کے عام قوانین عاید ہوتے ہیں۔ حیاتیات میں حیات نامی کے تنظیم و عمل کے جن طریقوں کی تحقیق کی جاتی ہے وہ سب عمرانیات کے تحت میں بھی آتے ہیں۔ مگر عمرانیات میں وہ اور بھی زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انسانی خیال اور ارادہ کی کار فرمائی سے اس بحث میں اور دوسرے نئے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ ان انسانی ارادوں نے مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں ہمیشہ نئے نئے روپ اختیار کئے ہیں۔ فطرت کی ساری قوتوں میں ان سے زیادہ پیچیدہ اور کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ انسان کے دور ان خون کی کیفیت کو ایک سادہ اور ناقابل تغیر شکل کھینچ کر ظاہر کرنا آسان ہے۔ مگر معاشرہ میں تقسیم دولت کی کیفیت کسی ترسیبی شکل سے شاہدہ نہیں کیجاسکتی۔ اگر آپ تقسیم دولت کو ایک شکل کھینچ کر بتلانا چاہیں تو آپ کو بڑی کاٹ چھانٹ کر ناپڑے گی اور ہر دس سال کے بعد اس شکل کے خطوط میں تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔ چنانچہ ترسیبی اشکال کھینچ کر معاشی زندگی کے حقائق کا مشاہدہ نمایاں ثابت نہیں ہوا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ معاشیاتی عضویات کے مقابلہ میں ایک نامکمل علم ہے اور اس میں سمجھت بھی کم پائی جاتی ہے۔

باب

یہ سچ ہے کہ انسان اپنے تخلیقی اعمال میں فطرت سے اثر پذیر ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ فطرت سے اور دو قدم آگے بڑھنا بھی جانتا ہے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہمارے سارے اوزار و آلات ان صورتوں کو دیکھ کر بنائے گئے ہوں گے جو ابتدائی انسانوں نے اپنے گرد و پیش میں دیکھی ہوں گی مگر ساتھ ہی ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ اس تخلیقی عمل میں ان کی اپنی آماج اور حدت طرازی کو بھی بڑا دخل ہو گا۔ یہ ماننا کہ کھانے کا کٹا ہاتھ کے انگلیوں کی نقل ہے اور ہوا باز کے پنکھ چڑیوں کے پردوں کی نقل ہیں مگر ان کی تکمیل انسانی جودت طبع کی رہین منت ہے۔ ہمیں آج اس کا مشکل ہی سے اندازہ ہو سکے گا کہ ان دونوں مذکورہ ایجادوں کے لئے انسانوں نے صدیاں تک کیا کھیا سعی و جہد کے طریقے اختیار کئے اور اپنی عقل و ذہانت صرف کی عام طور پر سارے انسانی اعمال کا یہی حال ہے۔ اس کی حیات اجتماعی کی تنظیم کو لیجئے۔ اس کی ابتدا فطرت کے تنگ اور بے تحلف آغوش میں ہوئی۔ ہزار ہا سال کی متواتر سعی و عمل کے بعد معاشرہ اپنے اس اعلیٰ مرتبہ تک پہنچا ہے جہاں ہم آج اسے پا رہے ہیں۔ آج ہماری اجتماعی زندگی صدیوں کے اختراعی نتائج کی حامل ہے۔ جن کی بدولت تہذیب انسانی کی عظیم شان اور وسیع عمارت تیار ہوئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس عمارت کی شان و شوکت ہی میں اس کی کمزوری مضمر ہے۔

ایک اور نقطہ نظر سے ہم اس عمارت کو عضونامی سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ انسان نے اپنی مختلف اور متواتر ذہنی سعی و جہد سے اس پر قابو حاصل کیا اور اسے اپنی ضروریات

باب ۹

کے لئے استعمال کیا اور اسے ترقی دی۔ اسپیناس نے اسی خیال کو کس قدر دل نشین انداز میں بیان کیا ہے کہ معاشرہ کو درتصویرات و افکار کے عضو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے اسپنسر نے بھی معاشرہ کی اس خصوصیت کا مشاہدہ کیا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس خصوصیت سے انکار کرنا بہت دشواریاں ہے۔ اسپنسر جب بھی معاشرہ کو عضو نامی سے تشبیہ دیتا ہے تو اسے درعضو مافوقی سے تعبیر کرتا ہے۔

اس بحث سے، جیسا کہ اس باب کے شروع میں ہم نے کہا تھا، ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نظریہ ”جسم اجتماعی“ اور نظریہ ”معاہدہ عمرانی“ کے بنیادی تصورات میں ایک قسم کی مفاہمت ممکن ہے۔ ایک مشترک عنصر ایسا ہے جو اپنی پوری صحت کے ساتھ دونوں میں ملتا ہے۔ یہ دونوں نظریے حقیقت کے دو مختلف رخوں کی پردہ کشائی کرتے ہیں۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے اندر ضم کر دیں یا ایک کو دوسرے کے اوپر چسپاں کر دیں۔ دراصل نظریہ ”جسم اجتماعی“ معاشرہ کے آغاز سے بحث کرتا ہے اور نظریہ ”معاہدہ عمرانی“ معاشرہ کی اس حالت سے بحث کرتا ہے جو اس نے بعد میں اختیار کر لی ہیں۔ یہ بات پورے طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ معاشرہ بھی تقریباً اسی طرح سے عالم وجود میں آتا ہے جس طرح کہ اجسام نامی۔ اور اس کی تنظیم بھی انھیں قوانین کے ماتحت ہوتی ہے۔ جن کے مطابق زندگی میں نظم و ترتیب پیدا ہوتی ہے۔ پھر معاشروں کا نشو و نما اور ان کی ترقی میں انسانی سعی کو بڑا دخل ہے۔ معاشرہ ایک ایسے مقاصد کے حصول میں

سہ گرم تگیا پو ہو جاتے ہیں۔ جیہیں فی الواقع خود نفس انسانی نے متعین کیا ہے۔ مثلاً انصاف، امن، آزادی اور علم کے نصب العین انہیں مقاصد کو اپنے پیش نظر رکھ کر معاشرہ اپنے ارکان کے درمیان مساوات اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ جن کی خاطر دراصل اس نے یہ معاہدہ کیا۔ چنانچہ اس طریقہ پر معاشرہ ”عالم نامی“ کی ایک ایک منزل طے کر کے عالم عمرانی میں قدم رکھتا ہے۔ یہ سب کچھ ایسا غیر محسوس طور پر عمل میں آتا ہے کہ نہ دھچکے لگتے ہیں اور نہ وقفے پیدا ہوتے ہیں۔ نفس انسانی خود تسخیر چپ چاپ یہ سارا کام انجام دیتا ہے۔ الفرد فوسے کا قول ہے کہ ہمارے زمانہ کے تصورات و خواہشات کے مطابق معاشرہ کو ”جسم معاہدی“ کہنا درست ہوگا۔ اس اصول موضوعہ کی دونوں مصطلحات میں تصور ارتقا کی بدولت وحدت معنوی پیدا ہو گئی ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب ”موجودہ عہد میں علم عمرانیات“۔
 ۲۔ یعنی ایک ایسا ”جسم“ جو ”اعضا“ کے باہمی عہد و پیمان سے پیدا ہوا ہو۔
 ۳۔ ہم نے اپنی تصنیف ”جسم اور معاشرہ“ میں نظریہ ”جسم اجتماعی“ کے اصول کا تتبع کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکی ہے اس کے بعد تحقیق، تجربہ و مشاہدہ اور غور و فکر سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمارے خیالات میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور ہم نے اپنی ابتدائی تحقیق میں جن اصول کی رہبری میں کام کیا تھا اب ضرورت اس کی ہے کہ ان کی جگہ دوسرے اصولوں کو تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اپنی بعد کی تصنیفات میں اپنے نتائج و اصول کے تعین میں پوری احتیاط برتی ہے۔ ملاحظہ ہو ہماری تصنیف ”علوم عمرانی کا فلسفہ“ کی تین جلدیں (دیکھاؤ ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء، اور دوسرا ۱۹۸۰ء)۔ اور ہماری کتاب ”ارتقاء اجتماعی کے حیاتیاتی اصول“ مطبوعہ ۱۹۷۸ء۔ اس کے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸)

دسواں باب

علم عمرانیات کی تقسیم | اگر ہم معاشرہ کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس سے جسم نامی سے مشابہ سمجھتے ہیں تو ضرور ہے کہ اس کی تحقیق اور علوم طبیعی کے تحقیق و مشاہدہ میں ایک طرح کی مناسبت موجود ہو علوم طبیعی اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ ہم ان کی روشنی اور بصیرت سے عمرانیات کو بہت کچھ مستفیض کر سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا کرنا ممکن ہے اور اس کے دو طریقے ہیں۔ اول تو یہ کہ علوم طبیعی کے مشاہدات کی بدولت ہم عمرانیات کے موضوع کی ٹھیک ٹھیک تقسیم کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم عمرانیات کے طریقہ تحقیق کو متعین کر سکتے ہیں اس باب میں ہم عمرانیات کے موضوع کی تقسیم کے متعلق کچھ عرض کر دیں۔

عمرانیات کے موضوع بحث کی تقسیم کا مسئلہ سب سے پہلے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ علاوہ اس کتاب کے آئندہ ابواب میں بھی ہمارا نقطہ نظر یہی رہا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اپنی ابتدائی کتاب جسم اور مشابہ کو دوبارہ طبع کرائیں اور اس میں سے دو حصہ نکال دیں جسے ہم اب غلط سمجھتے ہیں اور اس کے باقی رہنے والے عناصر کی پورے طور پر تصحیح کر دیں۔

اس علم کے بانی آگست کونت نے چھیڑا تھا۔ اس سلسلہ کا بہترین باب حل اسے اس میں نظر آیا کہ عمرانیات اور میکانک میں تعلق پیدا کرنا چاہئے۔ اس کا یہ کہنا اس لئے ٹھیک تھا کہ وہ عمرانیات کو ”طبیعیات اجتماعی“ سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے عمرانیات کے دو حصے قرار دیئے ہیں۔ سکونی عمرانیات اور حرکتی عمرانیات۔ اس نے اپنی کتاب ”فلسفہ ایجابی کے اسباق“ میں چھ جلدوں میں سے پوری تین جلدوں میں نفس عمرانیات پر بحث کی ہے، چوتھی جلد میں سکونی عمرانیات اور پانچویں اور چھٹی جلد میں حرکتی عمرانیات کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ اپنی ایک اور دوسری کتاب ”نظام سیاست ایجابی“ میں دوسری جلد میں سکونی عمرانیات اور تیسری جلد میں حرکتی عمرانیات کے مسائل سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب کل چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آگست کونت کے نظریہ کے مطابق سکونی عمرانیات کا موضوع بحث معاشرہ کی تنظیم ہے اور حرکتی عمرانیات انسانی ارتقا سے بحث کرتی ہے۔ اول الذکر معاشرہ کے عناصر یا بندہ کا مشاہدہ کرتی ہے اور آخر الذکر اس کے تغیر پذیر عناصر کی تحقیق کرتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ عمرانیات کی اس قسم کی تقسیم میکانک اور علم الحیات کی تقسیموں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ اس کے نزدیک عضویات اور سکونیات میں وہی مناسبت ہے جو عضویات اور علم الحکمت میں ہے۔ ہماری رائے میں آگست کونت نے ان مسائل کی تصریح میں غلطی کی ہے۔ یہ غلطی ایسی بدیہی ہے کہ ہم ابھی آگے چلکر اسے مفصل بیان کریں گے۔

بابت

پہلے ہمیں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسکے خیالات میں ہماری رہنمائی کے لئے کون کون سی باتیں ہیں۔

آگت کونفٹ کے نظام خیالی میں سب سے زیادہ دلچسپ یہ نکتہ ہے کہ ہم معاشرتی زندگی کا مشاہدہ حالت سکون اور حالت حرکت میں کر سکتے ہیں۔ اس تصور کو آج بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ خود اس کے زمانہ میں تھی۔ اگر ہم معاشرہ کا سکونی حالت میں مشاہدہ کرنا چاہیں تو ہمارا مشاہدہ فی الحقیقت ایک مخصوص زمانہ تک محدود رہے گا اور اگر ہم اس کا حالت حرکت میں مشاہدہ کرنا چاہیں تو لازم ہے کہ ہم اس کی ان گونا گوں حالتوں کی تحقیق کریں جو وہ مختلف زمانوں میں اختیار کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم فرانس کے معاشرہ کے متعلق معلومات جمع کرنا چاہتے ہیں تو اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنی تحقیق کی خاطر کسی ایسی محدود شے کو لیں جو باسانی ہماری گرفت میں آسکے جیسے نور مندی یا گاسکوں کے علاقوں کی معاشرتی زندگی یا یہ کہ ہم مجسٹریٹ کے ادارہ یا صیغہ تعلیم کی نسبت تحقیق کریں۔ آخر الذکر تحقیق میں ہم اپنے پیش نظر اجتماعی وظائف کے نقطہ نظر کو رکھیں گے۔ ہمیں اختیار ہو گا کہ ہم کسی محدود یا وسیع ادارہ کی موجودہ حالت کی نسبت پوری تفصیل کے ساتھ معلومات جمع کر لیں۔ ہماری اس تحقیق کا تعلق سکونی عمرانیات سے ہو گا۔ اس کے برعکس ہم کسی ادارہ کی تاریخی تحقیق بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی اس کی ابتدائی حالت کی چھان بین کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ اس نے کون کون سی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اور پھر یہ کہ اس کی اب موجودہ حالت کیا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کا تعلق حرکتی عمرانیات سے ہو گا۔ تحقیق و مشاہدہ کے

یہ دونوں طریقے مساوی طور پر درست ہیں ان دونوں طریقوں میں خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ لیکن ان دونوں میں کوئی ایک بھی پورے طور پر حقیقت کے چہرہ کی نقاب کشائی نہیں کرتا۔ ہاں، دونوں ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ نکتہ کبھی نہیں فراموش کرنا چاہئے کہ یا تو تحقیق کرتے وقت ان دونوں کو ملا لینا چاہئے یا یہ کہ انھیں الگ الگ باری باری سے استعمال کرنا چاہئے۔ آگست کونت اس نکتہ کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اس کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس کی تصریح کی۔

اس مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں کا جہاں تک تعلق ہے ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری رائے آگست کونت کی رائے سے مختلف ہے۔ اول تو یہ کہ اس نے نفسِ اجتماعی کی سکونی حالت کو اس کی حرکتی حالت پر بلا ضرورت بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کے اندازِ تحریر سے ایسا ترشح ہوتا ہے جیسے معاشرے کی استحکم اور ناقابلِ تغیر نظام کے پابند ہوں اور ان کی مسلسل حرکت کے باوجود ان کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لیتیں۔ دراصل ہمیں اس میں شبہ ہے کہ آیا اس قسم کا کوئی نظام واقعی موجود ہے یا نہیں۔ عہدِ حاضر کے علمائے عمرانیات کے نزدیک ارتقاء ایک عظیم الشان حقیقت ہے جس سے اجتماعی زندگی کو بھی مفر نہیں اور جس کے مطابق ہر لحظہ میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے خیال میں حیاتِ اجتماعی کی رفتار ارتقاء کا رُک جانا مستثنیات میں سے ہے۔ اور بعض تو غالباً اسے محض فریبِ نظر سے تعبیر کریں گے۔ اس لئے کہ ہم میں سے اکثر اس حالت کو حرکت کے فقدان سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ

بانت

ہمارے حواس یا ہمارے نفس پر اس کے عمل کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی کیفیت محض موضوعی وجود رکھتی ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ حرکت ایک دائمی چیز ہے۔ اب اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اجتماعی زندگی کے سب بڑے بڑے مسائل کا حل نہیں حرکتی عمرانیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں سکونی عمرانیات کی حیثیت نفس بشری کے ایک سہل العمل طریقہ تحقیق سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ حرکتی عمرانیات کی رو سے ہم حیات اجتماعی کا صرف ایک تصور قایم کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ معاشرہ کی حالت ایک لمحہ قبل کچھ اور تھی اور ایک لمحہ بعد کچھ اور ہو جائے گی۔ ہر لمحہ وہ نیت نئے رویہ اختیار کرتا رہتا ہے۔ نظام ہے اس قسم کے تصور کی حیثیت محض وقتی اور عارضی ہوگی۔ ممکن ہے کہ یہ تصور بالکل درست ہو اور اسی وجہ سے غالباً ہمارے واسطے بصیرت افروز ہوگا مگر اس کی وساطت سے ہیں جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نہایت محدود اور عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور علم ایک ایسی چیز ہے جسے سب کچھ گوارا ہے مگر یہ کبھی گوارا نہیں ہو سکتا کہ اسے عارضی سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ آگست کو نت کے اصول تقسیم میں اور دوسری غلطیاں بھی ہیں۔ اول یہ کہ اس نے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ بہت ناقص ہیں۔ ان سے غیر صحیح تصورات کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ دراصل کو نت کی تمام تر کوشش کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عمرانیات اور میکانک کو پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرے۔ چنانچہ اسی بنا پر اس نے عمرانیات کو سکونی اور حرکتی میں تقسیم کیا۔ مگر خود میکانک کی

تقسیم تین حصوں میں کی گئی ہے۔ سکونی، حرکتی اور کنہائی۔ خالص بائبل حرکت دراصل علم الحركت کا موضوع بحث ہے نہ کہ حرکتی میکانک کا نظریہ ہے کہ کونٹ جو کہ خود بہت بڑا ریاضی داں تھا اس لئے وہ ان ابتدائی تصورات سے بے خبر نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ پیرس کے مدرسہ پولی ٹیکنک میں تجزیہ و میکانک کے استاد کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔ چنانچہ اس پر ہمیں خود تعجب ہے کہ حیات اجتماعی کی حرکت کے واسطے بجائے علم الحركت کے حرکتی عمرانیات کی اصطلاح کیوں استعمال کی۔ اسے یہ بات معلوم ہوتی چاہئے تھی کہ ان اصطلاحوں کے مروجہ معنوں کی وجہ سے اس باب میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا قوی احتمال ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی یہ کہ میکانک عمرانی کے تین عناصر دو میں فہم ہو گئے۔ اس طرح اس نے عمرانیات جیسے پیچیدہ علم میں ایک اصطلاح کی تخفیف کردی حالانکہ اگر یہ اصطلاح غیر ضروری ہوتی تو پہلے خود میکانک جیسا سادہ علم اس کو غیر ضروری جان کر کیوں نہ ترک کر دیتا۔ دراصل آگست کونٹ کے ایسا کرنے کی وجہ دوسری غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس کی نسبت ہم ابھی کچھ عرض کرتے ہیں۔

آگست کونٹ کی اس دوسری غلط فہمی کی تفصیل یہ ہے کہ اس نے میکانک اور علم حیات کی عام تقسیم کے اصول کو آپس میں گڈ کر دیا۔ علم حیات کو علم تشریح اور عضویات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کونٹ کو یہ دھوکا ہوا کہ حیات اجتماعی میں بھی سکونی عمرانیات کی حیثیت علم تشریح کی سی ہے اور

لہ Kinematics (علم الحركت) خالص حرکت سے بحث کرتی ہے اور Dynamics (حرکیات) میں حرکت اور وقت جس سے حرکت پیدا ہوتی ہے دونوں کی تحقیق کی جاتی ہے۔

باب

حرکتی عمرانیات کی عضویات کی لیکن حرکتی عمرانیات کا اس نے جو تصور پیش کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے غرضکہ ایک عجیب الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تشریح اعضاء کی ساخت کا علم ہے اور عضویات ان کے افعال و وظائف کی تحقیق کرتی ہے۔ اور کونٹ کے نزدیک سکونی عمرانیات اجتماعی زندگی کی اس حالت سے بحث کرتی ہے جب کہ وہ عالم جمود میں ہو اور حرکتی عمرانیات اس کے متغیرات کا جائزہ لیتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تشبیہ کو واضح کرنے کے لئے کہتا ہے کہ علم تشریح بھی اعضاء کی سکونی حالت سے بحث کرتا ہے اور عضویات ان کی متحرک حالت کو پیش کرتی ہے۔ یعنی جس وقت ان سے افعال ظہور پذیر ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ذرا عمق نظر سے دیکھا جائے تو اس میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کہ اعضاء کی حرکت سے مراد ان کے معمولی وظائف ہی نہیں بلکہ وہ تغیرات بھی ہیں جو ان وظائف کی بدولت ان کی ظاہری صورت میں کوئی پذیر ہوئے رہتے ہیں۔ ان کے ارتقار کا یہی مطلب ہے۔ کونٹ نے حرکت کا لفظ جہاں استعمال کیا ہے یعنی Kinematics کے معنی میں اس کے لحاظ سے ذی روح اجسام کی حرکت ان کی ارتقائی حالت سے جدا نہ سمجھنا چاہئے۔ اب رہا عضویات اور علم تشریح کے موضوع بحث کی نسبت کوئی فیصلہ کرنا تو ایک اعتبار سے یہ درست ہے کہ عضویات میں بھی سکونی حالت کا اسی قدر لحاظ رکھنا پڑتا ہے جتنا کہ علم تشریح میں۔ عضویات بھی علم تشریح کی طرح ایک متعین وقت میں اعضاء کے وظائف کا تجزیہ مشاہدہ کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے علم تشریح ایک معین

وقت میں اعضا کی حالت کی تحقیق کرتی ہے۔
 تعجب ہے کہ باوجود علم حیات میں کمال دستگاہ رکھنے
 کے آگست کونٹ نے یہ تجزیہ اس قدر سادہ اصول پر کیا۔
 نہ معلوم اسے یہ بات کیوں نہ سوجھی کہ وظائف اعضا کی
 سکونی حالت اور ان کے پیہم تغیر کی متحرک کیفیت میں فرق
 ہے۔ اول تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ معمولی وظائف اعضا اور
 ان کے تغیر کی حالت کو اصل ایسے مظاہر ہیں جو فطرۃً
 ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اشیاء کا تغیر ان کے وظائف
 ہی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اعضا کی حرکات ہی ان کے نشوونما
 اور ان کے انحطاط کی ضامن ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں
 چاہیے کہ معلول کو علت میں ضم نہ کر دیں۔ آگست کونٹ اس
 غلط فہمی میں اس لئے مبتلا ہو گیا کہ اس کے زمانے تک
 دنیا ارتقاء نامی کے اصول سے مطلق نا آشنا تھی۔ ہم اس
 باب میں اس کے زمانے سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔
 یہ درست ہے کہ آگست کونٹ لمارک سے واقف تھا۔ وہ
 اس کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کا بڑے احترام
 سے ذکر کرتا ہے۔ مگر بایں ہمہ کونٹ نے لمارک کے نظریہ کو
 قبول نہیں کیا اس واسطے کہ وہ جانتا تھا کہ سارے حکماء
 عہد اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں کونٹ ڈارون کے
 نظریہ سے بے خبر رہا اس لئے کہ ڈارون کی کتاب اصل لاطین
 کے طبع ہونے سے دو سال قبل اس کا انتقال ہو چکا تھا۔
 بہر حال ہمیں یہ معلوم ہے کہ آگست کونٹ نظریہ ارتقاء کے

لے ہم نے اس مسئلہ کی مزید توضیح اپنی کتاب دو علوم اجتماعی کا لب العین میں
 کی ہے۔ ملاحظہ ہو سوال باب۔

باب

ماننے والوں میں سے نہ تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مظاہر تغیر کے باب میں اس کی نظر چوک گئی اور وہ ان کی حقیقی ماہیت سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ جس مظہر کو وہ حرکت نامی کی اصطلاح سے واضح کرنے کی کوشش کرتا رہا اس کو بعد ارتقاء کہا گیا۔ ہر حال اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ آگست کو نت ارتقاء نوعی کے نظریہ سے بے خبر تھا تب بھی بظاہر یہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ اس نے ارتقاء سے انفرادی کی طرف سے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی ہوگی۔ دوسروں کی طرح وہ بھی یقیناً اس حقیقت سے آگاہ ہو گا کہ ہر جسم نامی کو مختلف حالتوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے بعض پیدائش شباب، اوج، عمر، بڑھاپے اور پھر فنا کی منزلوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض جگہ اس کے انداز تحریر سے اس کا تشریح ہوتا ہے کہ اس کو اس امر کا احساس تھا کہ اعمال تغیر اعضاء کے مسمولی وظائف سے علیحدہ جدا گانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی خیال کو واضح کرنے کے واسطے اس نے بعد میں ہستی و حیات کے دو الگ الگ تصورات پیش کئے۔ اس کے بعد اس کے شاگرد لیتر کے نے عضویات کہے ان دو حصوں میں امتیاز قائم کیا جن میں سے ایک کا مقصد جسم کی پرورش ہے اور دوسرے کا مقصد اس کا نشو و نما ہے مگر آپ دیکھیں کہ اس بحث کی بنیاد میں بننے والے پیش کئے گئے وہ سب ناکافی ثابت ہوئے۔

ہمارے نزدیک یہ بہتر ہو گا اگر ہم میکانک کی سرگوند تقسیم کو عمرانیات اور حیاتیات جیسے پیچیدہ علوم میں رائج

لے وہ اپنی کتاب ”نظام سیاست اجمالی“ جلد ۲، باب ۶ میں کہتا ہے: ہر وجود کی زندگی عبارت ہے ان تغیرات سے جو اس میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔“

کر لیں۔ چنانچہ حیاتیات میں تشریح کو سکون اور عضویات کو حرکت بانٹتے متصف کر سکتے ہیں اور اسی طرح عمل ارتقاء Kinematics کے مترادف مہرے گا۔ یہ اصطلاحی مناسبت ہمارے خیال میں مطلق حیثیت نہیں رکھتی لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں اس مطلقیت سے زیادہ صحت ہے جو کونٹ نے قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ ہم عمرانیات میں بلا کسی زحمت کے حیاتیات کا طریقہ تحقیق اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اجسام نامی اور معاشروں کی ظاہری مشابہت سے دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ ان دونوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(۱) ان کے عناصر مشتمل اور ان کی تنظیم یعنی اجتماعی ڈھانچے اور ان کے اعضاء۔

(۲) ان عناصر و اعضاء کے وظائف۔

(۳) ان عناصر و اعضاء کا ارتقاء یعنی ان کی ساخت اور ان کے وظائف کی پیہم تبدیلیاں۔

چنانچہ اس مذکورہ بالا تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے عمرانیات کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اور ان تینوں حصوں کے لئے ہم حیاتیات ہی کی اصطلاحیں استعمال کر سکتے ہیں۔ تشریح عمرانی، عضویات عمرانی اور ارتقاء عمرانی۔ اور اگر کسی کو میکانک ہی کی اصطلاحات برقرار رکھنے پر اصرار ہو تو ہم یوں کہیں گے سکونی عمرانیات، حرکتی عمرانیات اور کنٹائی عمرانیات۔

ان سب اصطلاحوں میں بڑا نقص یہ ہے کہ ان کی وجہ سے عمرانیات کے ڈانڈے ایک ایسے علم سے جاملتے ہیں جو بجائے خود بہت سادہ ہے۔ ان سے آدمی اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ گویا عمرانیات نے اپنے تئیں

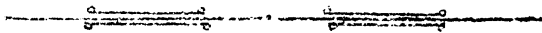
بابت کلیہ حیاتیات کے تابع کر لیا۔ ہمارا اپنا خیال ہے، ممکن ہے اس خیال میں بعض معترضین کو غلطی شان نہ نظر آئے، کہ عمرانیات کے پیش نظر تین چیزوں کی تحقیق ہونی چاہیے :-

(۱) اجتماعی ڈھانچے

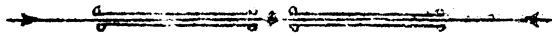
(۲) اجتماعی اعمال و وظائف

(۳) اجتماعی ارتقاء

ہیں یقین ہے کہ اس بارے میں کسی کو کوئی اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہے گی۔



گیارھواں باب



عناصر اجتماعی | کسی خاص انسانی جماعت کے متعلق عالم عمرانیات اس وقت تک کوئی تحقیق نہیں کر سکتا جب تک کہ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ جماعت کن کن عناصر پر مشتمل ہے اور ان عناصر کی ترکیب کس پہنچ پر ہوئی ہے۔

خود ان عناصر کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول انسان، جن پر ہماری نظر سب سے پہلے پڑتی ہے اور جن کے مجموعے سے بدایتہ جماعت عبارت ہے۔ دوسرے وہ اشیاء جو ہیں انسان کے دوش بدوش نظر آتی ہیں اور جن کا انسانی اعمال سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ دراصل ان اشیاء کو بھی انسانوں کی طرح معاشرہ کے عناصر میں شمار کرنا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ اشیاء کی حیثیت وہ نہیں ہوتی جو انسانوں کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ عموماً مجہول ہوتی ہیں لیکن ہمیں یہ نہ فراموش کرنا چاہئے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کا وجود حیات اجتماعی کھیلنے

بارگ

ناگزیر ہوتا ہے۔ ان کے بغیر انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ چنانچہ عالم عمرانیات کی نظر میں ان کی اہمیت بے جا نہیں۔ اس واسطے پہلے ہم ان اشیاء کے متعلق اظہار خیال کر دیں اور یہ بتا دیں کہ اجتماعی زندگی کس حد تک ان کی رہنمائی ہوئی ہے۔ پھر اس کے بعد حیات اجتماعی کے سب سے زیادہ اہم عنصر یعنی انسان کی نسبت ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔ معاشرہ کے غیر انسانی عناصر یعنی اشیاء کو علمائے عمرانیات نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ جو براہ راست فطرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور دوسرے وہ جو انسانی صنعت کے توسط سے وجود میں آتی ہیں۔

جن اشیاء کا تعلق بلا واسطہ فطرت سے ہے ان میں سے بعض کے متعلق ہم یہاں ذکر کریں گے۔ سب سے پہلے زمین کو سمجھئے۔ ظاہر ہے کہ سارے انسانی اعمال زمین ہی پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ زمین کی ظاہری شکل و صورت کا انسانی اعمال پر خاص اثر پڑتا ہے، خاص کر اگر اس خطہ زمین کو پہاڑ یا سمندر سے قرب حاصل ہے۔ پھر اس کے علاوہ زمین کے اندر جو جو دھاتیں ہوتی ہیں، یا درختوں کو اس سے جو خوراک ملتی ہے اس کا اثر صنعت و حرفت اور کاشتکاری پر بڑا لازمی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اسی مناسبت سے ہم زمین کی بالائی فضا کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس بالائی فضا میں اس خاص خطہ کی آب و ہوا، رعد و برق اور دوسرے مظاہر فضاوی، اور وہ ساری طبیعیاتی قوتیں شامل ہیں جو عالم عمرانیات کی دیکھی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اسی ضمن میں ہم اس خطہ کے نباتات و حیوانات کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یہ سب عناصر انسان پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں اور خود انسان

ان سب کو اپنے خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اس طرح یہ سب اس کے اعمال میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

انسان اور بیرونی فطرت کے اس تعلق سے وہ دوسری قسم کی اشیاء وجود میں آتی ہیں جنہیں ہم صنایع کہتے ہیں اور جو انسانی صنعت سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہم نے اس جگہ لفظ ”صنعت“ اسی معنی میں استعمال کیا ہے جس میں اسے کین نے استعمال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”صنعت مجموعہ ہے انسان اور فطرت کا“۔ اس واسطے کہ فطرت محض انسان کی صنعت کے مادہ کو فراہم کرتی ہے۔ انسانی عمل سے یہ مادہ تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ ان صنایع کی بدولت انسان کی خاص خاص احتیاجات پوری ہوتی ہیں۔ انہیں سے ہمارے خورد و نوش،لبوسات، مکانات اور خانگی سازوسامان تیار ہوتے ہیں۔ انہیں کی بدولت ہماری تعیشات کی چیزیں جیسے زیورات وغیرہ بنتے ہیں۔ جو اگرچہ نظام بریکار سہی مگر انسانوں کی ایک بڑی تعداد انہیں ضروری سمجھتی ہے اور عزیز رکھتی ہے انہیں سے اسلحات بنائے جاتے ہیں اور انہیں سے وہ آلے بنتے ہیں جن کی وساطت سے مذکورہ بالا مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔

فطرت اور صنعت کے نازک فرق کو بعض اوقات اچھی طرح تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی پھل جب تک کہ وہ درخت پر رہتا ہے اس کا شمار فطرت میں ہو گا لیکن جب انسان نے اسے توڑ لیا اور اس میں انسانی خوراک کا جز بننے کی صلاحیت موجود ہے تو ایسی حالت میں اس کا شمار آخر الذکر میں کیا جائے گا۔ اس موقع پر ہم یہ صراحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تقسیم کو بے جا اہمیت دینے

باب

ضابطوں سے جکڑ بند کرنے اور غیر ضروری غلو برتنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ نفس انسانی اپنے افکار و تصورات میں نظم و ترتیب پیدا کرنے کی خاطر اشتیاء اور افکار کے درمیان ایسے ایسے نازک اور دقیق امتیازات گھڑ لیتا ہے جو حقیقت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ معاشرہ کی ساخت میں غیر انسانی عناصر کا جو درجہ ہے اس کی اہمیت سے عمرانیات چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی ٹھیک نہیں کہ انھیں غیر ضروری اہمیت دی جائے۔ بعض علماء عمرانیات کے نظام افکار میں غلو سے کام لیا گیا ہے اور ان عناصر کو انسان سے زائد اہم بتلایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ادمون دیولان کا نام پیش کر سکتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انسان کی ساری خصوصیات کا دار و مدار اس کی خوراک پر ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک ہرنسل انسانی کی خصوصیات ان جسمانی حالات سے پیدا ہوئیں جن سے اس خاص نسل کے بزرگوں کو اُس وقت دو چار چونا پڑا تھا جب کہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہے تھے۔ اس کے برعکس کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق حیات اجتماعی کی ساخت میں معاشی پیداوار کے آلات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس واسطے کہ انسان کی سیاسی، ذہنی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل میں مادی ضرورت کو پورا کرنے کے طریقے کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دراصل

لے ملاحظہ ہوں ادمون دیولان کی تصانیف ”عہد موجودہ کے فرانسیسی“ اور انسانی نسلوں کی شاہراہیں۔“

زندگی میں یہ سب سے زیادہ موثر عنصر ہے۔ ہمارے خیال میں ان نظریوں میں مبالغہ کو راہ دی گئی ہے۔ اور محقق کا یہ فرض ہے کہ وہ عدل و اعتباط کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے گا ساتھ ہی ہیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان نظریوں میں جو بات صحت کے معیار پر پوری اترتی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ انسان فطرت اور اشیاء کا محتاج ہے۔ حیات اجتماعی کی ساخت میں غیر انسانی عناصر کو حل ہے جتنی زیادہ اہمیت دی جائے مگر انسانی عناصر ان سے ہیں بڑھ کر اہم ہیں۔ ان کی تحقیق میں ہیں علوم فطری اور علوم عمرانی دونوں کی چھان بین کرنا پڑے گی۔ علوم فطری سے ہیں صرف ان خصوصیات کا پتہ چلے گا جو ساری نوع انسانی میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔ اور علوم اجتماعی سے ہم ان خاصائص کا سراغ لگا سکتے ہیں جو انسانیت کے مختلف اجزا میں موجود ہیں۔ چنانچہ علم تشریح انسانی جسم کی عام ساخت سے بحث کرتی ہے اور علم اعداد و شمار اور علم نسل انسانی کی بدولت ہم کسی خاص انسانی آبادی کے متفرق اجزایا نسل کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں۔ انسانی آبادیوں اور نسلوں کو سمجھنے کے لئے اور یہ جاننے کے لئے کہ عمرانیات ان کے حقائق سے کیونکر استفادہ کر سکتی ہے۔ ہمیں اپنی تمام تر توجہ اس حقیقت کے انکشاف کی جانب منقطع کرنی چاہئے کہ انسان کن محرکات سے اثر پذیر ہو کر اجتماعی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ اس کے لئے پہلے ہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب ”سرایہ“

۲۔ ملاحظہ ہو جون برن کی تصنیف ”انسانی جغرافیہ“

باب

حیات اجتماعی کے ڈھانچے معاشرہ کے انسانی عناصر کے باہمی نظم و ربط سے کیونکر تیار ہوتے ہیں۔

مشاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ کم سے کم پانچ طبقے ایسے ہیں جن کی بنا پر ان انسانی عناصر کے اجتماعی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی کی سب سے قدیم صورت رشتہ نسب و قرابت سے پیدا ہوئی ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے خون کے تعلق کی بدولت ایک دوسرے کے ساتھ وابستگی پیدا ہوئی۔ لیکن اس کی بھی مختلف نوعیتیں رہی ہوں گی۔ بہت عرصہ تک بعض تحقیق کا یہ عقیدہ رہا کہ اجتماعی زندگی کی قدیم ترین صورت خاندان پدرسری یعنی وہ خاندان ہے جس میں نر (باپ) کو پورا اختیار و اقتدار حاصل ہوتا تھا۔ اس نظریہ کی تائید میں روماء، یونان، ہندوستان اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن نصف صدی سے اس مسئلہ کی نسبت برابر تحقیق جاری ہے اور نئی نئی باتیں پیش کی جا رہی ہیں۔ باغیوں ایک لیٹن، ٹوکی مورگن اور ان کے دوسرے ہم چشموں کی تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ خاندان مادرسری اجتماعی زندگی کی قدیم ترین تنظیم ہے۔ اس تنظیم میں ماں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس پر یہیں تعجب نہ کرنا چاہئے کہ آج جو اصول ہیں فطری معلوم ہوتے ہیں ان سے بالکل متضاد اصول اکثر قدیم معاشرہوں میں رائج تھے۔ مثلاً یہ کہ قبیلہ کے باہر شادی کی جائے یا یہ کہ لازمی طور پر کسی مخصوص طبقہ کے اندر شادی کرنا اسی طرح کثرت ازدواج اور کثرت شو کی رسوم بھی عام طور پر قدیم زمانے میں پھیلی ہوئیں تھیں۔ بعض اوقات اولاد اپنے باپ سے لاعلم ہو کر تکی بھی اور ہر

فرد و سروں کے ساتھ ملکر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا اور وہ باب
اپنا الگ گھر بار نہیں رکھ سکتا تھا، وغیرہ۔ غرضکہ مختلف زمانوں
اور مختلف ممالک میں اس قسم کی رسوم کا پتہ چلتا ہے۔ اس
قسم کے مختلف نظاموں پر بحث کرنے کے بجائے ہم یہاں
صرف اتنا بتلانے پر اکتفا کریں گے کہ خاندان کی ابتدا کے
متعلق جو نظریے پیش کئے گئے ان میں موجودہ تحقیقات کی
بدولت بہت وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ مگر باوجود ان نئی تحقیقات
کے ہم اپنے اس دعوے میں کوئی تبدیلی قبول کرنے کے
لئے تیار نہیں ہیں کہ خاندان ہی وہ ادارہ ہے جو انسان کی
اجتماعی زندگی کی قدیم ترین یادگار ہے، چاہے اس کی تنظیم
کا مرکز باپ رہا ہو یا ماں۔
خاندان کے بعد جو اجتماعی تشکیل عمل میں آئی اس کا
محکمہ رشتہ نسب کے بجائے بڑے سے بڑے خاندان
جو قریب قریب آباد تھے ان میں باہمی رابطہ و ضبط بڑھا یہاں
تک کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد محل مل کے ایک ہو گئے۔ اس طرح
بڑے بڑے انسانی گروہ وجود میں آئے جنہوں نے اپنے
انتخاب کو قرب مکانی پر مبنی ٹھہرایا۔ چنانچہ خاندان بڑھتا بڑھتا
قبیلہ بن گیا۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے ان مختلف مراحل کے

لے لفظ ہو جیہرہ توکلون کی کتاب ”شادی اور خاندان کی ابتدا“ اس
کتاب کے طبع ہونے کے بعد اور دوسری کتاب میں اس موضوع پر شایع ہو چکی ہیں نئی تحقیقات
کے نتائج ”سائنس عمرانیات“ کی جلدوں میں مندرجہ صورت میں موجود
ہیں۔ اب تک کسی نے بھی ان جہت جہت نتائج کو ترتیب دے کر ایسی کتاب
نہیں لکھی جو قابل ذکر کہی جاسکے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نتائج بجائے
خود قطعی نہیں ہیں اور ان کی اہمیت بہت محدود ہے۔

باب

متعلق چونکہ اب تک بحث کا سلسلہ جاری ہے اس واسطے ہم مناسب یہی سمجھتے ہیں کہ ان ”ناموں“ کے جھگڑے میں نہ پڑیں جو ان مراحل کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ ہمیں یہاں اس سے مطلق سروکار نہیں کہ آیا ابتدائی انسانی گروہ بندی پہلے بقول لٹورن ”قبیلہ“ کا لفظ زیادہ موزوں ہے یا بقول ڈرگیم ”جھنڈ“ کا۔ ہم صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ جب انسان کسی مخصوص خطہ زمین پر آباد ہو گیا اور اس نے اور دوسرے انسانی گروہوں کو چاہے صلح اور امن سے اور چاہے جنگ و جبر سے اپنے میں ضم کرنا شروع کر دیا اس وقت قبائل ہی کے بطن سے ایک دوسری اجتماعی زندگی پیدا ہوئی جو ان سے جداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ قدیم یونانی شہر ایشیائی ملکیتیں، رومی ستھنشائی، اور ان سب کے بعد ہماری جدید یورپی اقوام وجود میں آئیں۔ ان موجودہ اقوام کی تنظیم میں انسان کی ابتدائی گروہ بندی کے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو خاندان آج بھی بدستور باقی ہے اور دوسرے یہ کہ رشتہ نسب کا اصول موجودہ نسلوں کے لئے سنگ بنیاد کا کام دے رہا ہے۔ نسل کیا ہے؟ یہ بھی درحقیقت ایک بڑے خاندان کے نسل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ نسل کے افراد میں ہمیشہ نسبی تعلق موجود ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جد تک یہ تعلق موجود ہو اس لئے کہ وہ لوگ جو اپنے کو ہم نسل بتاتے ہیں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک زمانہ میں، جو تعین کی سرحد سے پرے ہے، ان کے بزرگ ایک تھے۔ اسی امکان کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ہماری نسل کی رگوں میں ایک ہی خون موجزن ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی نسل مختلف اقوام کے علاوہ

میں پھیلی ہوئی ہو بالکل اسی طرح جیسے یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کی ملکی حدود میں مختلف نسلیں آباد ہوں۔ اس کے برخلاف افراد قوم کے تعلقات کو جو چیز متعین کرتی ہے وہ قربت مکانی ہے۔ مثلاً ہماری فرانسیسی قوم کی گروہ بندی کمیون کنٹن اردن دسمان اور ڈپارٹمنٹ کی صورت میں کی گئی ہے۔ دوسرے ملکوں، اضلاع و صوبجات کی تقسیم کی گئی ہے۔ ماہرین اعداد شمار اور وہ لوگ جنہوں نے انسانی آبادیوں کی گروہ بندی کے متعلق غور کیا ہے مختلف ممالک کی ملکی تقسیموں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ ان ماہرین کی تحقیق یہ بتلائی ہے کہ ریاست کی انسانی آبادی کی نسبت معلومات حاصل کرنے کے لئے صرف اعداد و شمار ہی جاننا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ رسل و رسائل کی آسانی کے متعلق کھوج لگائیں اور یہ دیکھیں کہ آبادی کہاں زیادہ گنجان ہے اور شہروں اور دیہاتوں میں یہ آبادی کیوں کر بٹ گئی ہے۔ چنانچہ اس ساری بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ باوجود ہزار ہا سال گزر جانے کے انسانی گروہ بندی کے قدیم محرک یعنی نسب اور پڑوس آج بھی ہماری اجتماعی زندگی میں کار فرما ہیں۔

ان محرکات کے علاوہ اور بھی ہیں جو ہماری زندگی میں موثر ہیں۔ مثلاً ہم پیشہ ہونے کا محرک۔ ہر بڑے معاشرے

لے فرانس میں ملکی نظم و نسق کی سب سے چھوٹی تقسیم کمیون کہتے ہیں۔ کئی کہتے ہیں کہ کمیون کنٹن بتا ہے۔ اور کمیون کنٹن کے مجموعے کو اردن دسمان کہتے ہیں۔ ڈپارٹمنٹ کی وہی حیثیت سمجھنی چاہئے جو ہندوستان میں صوبوں کی ہے۔ ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ ملکی عہدہ دار کو بریٹے کہتے ہیں۔ مترجم

باب

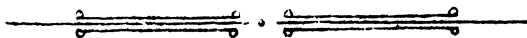
میں تقسیم کار کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔ بعض لوگ اپنے تئیں ایک مخصوص کام کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ شروع شروع میں ان لوگوں میں آپس میں ہم مشربی کا خیال پیدا ہوتا ہے پھر ہوتے ہوئے یہی احساس برادری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اغراض و مفاد کے اشتراک کی بدولت ان میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے شخصیت (کارپوریشن) اور ہمارے زمانے کی سنڈیکیٹ اسی اصول پر وجود میں آئی ہیں۔ ہم نے ان دونوں کا ذکر اس غرض سے یہاں کیا تاکہ اس خاص نوعیت کی گروہ بندی کی اہمیت واضح ہو جائے۔ بلکہ ہمارے نزدیک تو یہ کہنا درست ہو گا کہ موجودہ زمانے میں اجتماعی زندگی کی تشکیل اسی اصول پر ہو رہی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ پیشوں اور طبقوں کے تصورات کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈ نہ کر دیں۔ وہ سب لوگ ہم پیشہ کہلائیں گے جو اپنی ذاتی محنت اور سعی سے ایک خاص قسم کا نتیجہ برآمد کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے غرض نہیں کہ حیات عمرانی میں انھیں کوئی مرتبہ جہل ہے۔ چنانچہ فرانس میں پیشہ تعلیم میں ان سب لوگوں کا شمار کیا جائے گا جو تعلیم و تدریس کا کام کرتے ہیں یا کسی اور حیثیت سے ان کا سررشتہ تعلیمات سے تعلق ہے۔ اس میں ریکٹر (Rector) سے لیکر گاؤں کا ادنیٰ سا مدرس سب ہی شامل ہیں۔ اس کے برخلاف طبقہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو معاشرے میں ہم مرتبہ ہوتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے پیشہ اور کام کی نوعیت کیا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے ریکٹر کا شمار عمائدین سلطنت، قائدین ملت، اہل ثروت اور علمی دنیا کے چوٹی کے لوگوں کے ساتھ ایک طبقہ میں کیا جائے گا۔ اور گاؤں

کے غریب مدرس کو علم کے لوگوں اور صنعت و حرفت کے معمولی بابلا کارکنوں کی صف میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ جس دن سے ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے مزدوروں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے اتحاد کی قوت کو اپنے جائز مشترک مفاد کی نگہداشت کے لئے استعمال کریں۔ اس دن سے طبقہ داری گروہ بندی کو دن بدن فروغ ہو رہا ہے۔ اس پر بڑی بڑی بحثیں ہو چکی ہیں کہ معاشرے میں یہ طبقے کیسے پیدا ہوئے؟ دراصل طبقوں کا احساس ان کی باہمی کشمکش سے پیدا ہوا اور اب اس نے ایک متعین صورت اختیار کر لی ہے۔

ان گروہ بندیوں کے علاوہ اور دوسری گروہ بندیاں ہیں جن کی نسبت یہاں ذکر کرنا ضروری ہے۔ مثلاً بعض لوگ اپنے مشترک مقاصد کے اصول کے لئے باہم جمع ہوتے ہیں ان مقاصد کی وہ خود اپنی پسند اور مرضی سے تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ کمپنیاں اور انجمنیں ہمارے زمانے کی حیات اجتماعی کی پیچیدہ اغراض اور متنوع دلچسپیوں کے باعث وجود میں آتی ہیں۔ سماجی دنیا میں تجارتی کمپنیاں اسی اصول پر وجود میں آتی ہیں۔ ذہنی دلچسپیوں کے اعتبار سے علمی، ادبی اور صناعانہ انجمنیں قائم کی جاتی ہیں۔ مذہبی خیال والے اپنے فرقے اور سیاست میں اذہل رکھنے والے اپنی پارٹیاں بناتے ہیں۔ خوش وقتی کے لئے لوگ بزم، حلقے اور انجمنیں قائم کرتے ہیں جہاں ہم خیال دوست اپنا وقت گزاریں گے۔ وہ جن کے دل میں انسانیت کا درد ہے ”خدمت خلق“ کی انجمنیں قائم کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر گوشے

باب

میں انسانوں کا باہمی اتحاد و تعاون بڑھ رہا ہے، ان کی تنظیم کو روز افزوں تر بنی ہو رہی ہے۔ اسی تعاون عمل کے صدقے میں انسانی پیداوار کی بوقلمونی ہماری نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے دوسری طرف خود انسان ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اپنے سارے محبوب مقاصد حاصل کرتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ یہ سچ ہے کہ اسی انسانی تعاون میں خود اس کی تباہی کا سامان بھی موجود ہے اور یہ خطرہ ہی اس تحریک کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس تعاون عمل کے فیضان کا اثر ہے کہ انسان اپنی سعی و جہد سے انتفاع کر رہا ہے۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ انسان کا مستقبل اس کے باہمی تعاون کی صلاحیت ہی میں مضمر ہے اور اسی میں اسے فلاح و سعادت کی راہ مل سکتی ہے۔



بارہواں باب

حیات اجتماعی معاشرہ کے مختلف عناصر ترکیبی کو متعین کر چکنے کے بعد ہمیں چاہئے کہ ان کی کارگزاری کا مطالعہ کریں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان عناصر کے وظائف اجتماعی زندگی میں کیا نوعیت رکھتے ہیں؟ چونکہ سارے مظاہر عمرانی ان عناصر کے تعامل سے وجود پذیر ہوتے ہیں اس لئے سب سے پہلے ہم چاہئے کہ ان مظاہر عمرانی کی چھان بین کریں اور انہیں مختلف مقدمات کے ماتحت ترتیب دیں۔ اس کے بعد ہم ان مختلف مقدمات کے باہمی ربط و تعلق پر بحث و فکر کریں گے۔

حقایق عمرانی شمار سے باہر ہیں۔ ان میں تنوع اور پیچیدگی پائی جاتی ہے، اسی بنا پر ان کی ٹھیک ٹھیک تقسیم نہایت دشوار اور نازک کام ہے۔ اس کے لئے متعدد بار کوششیں ہو چکی ہیں اور خود ان کوششوں کے طریقے شروع شروع میں متضاد ہوتے تھے۔ لیکن اب ادھر چند سالوں سے ان طریقوں ایک گونہ ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہے۔ غالباً تھوڑے درجہ یہ سارے طریقے ایک ہی سانچے میں ڈھل جائیں گے۔

باب ۳

کے اختلافات دور ہو جائیں گے۔ جب ایسا ہو گیا تو ہم کہہ سکیں گے کہ مظاہر عمرانی کے مقدمات ترتیب پا چکے۔ اب ہم یہاں ان مختلف نقطہ ہائے نظر کو پیش کرتے ہیں جن سے ان مقدمات کے فرق کو واضح کیا جاسکتا ہے۔

پہلے کے ایک مشہور عالم عمرانیات موسیو گیوم دے گریف نے جو برسکیز کی نئی یونیورسٹی کے ریکٹر رہ چکے ہیں۔ آگست کونت کے اصول سے ان مظاہر عمرانی کی تقسیم اخذ کی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ آگست کونت نے علوم کی درجہ بدرجہ تقسیم میں اس امر کو مد نظر رکھا تھا کہ وہ علوم علیحدہ رکھے جائیں جن میں دن بدن پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے اور انھیں الگ رکھا جائے جن کے موضوع کی تقسیم دن بدن کم ہو رہی ہے، چنانچہ اس اصول کے موافق آگست کونت نے مظاہر فکلی، طبیعی، کیمیادی، حیاتیاتی، اور عمرانی کے مابہ الامیاز کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ گیوم دے گریف نے اسی اصول پر مظاہر عمرانی کو سات مقولات میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے: مظاہر معاشی، مظاہر خاندانی، مظاہر صناعی، مظاہر ذہنی (جس میں مذہب اور علم شامل ہیں)، مظاہر اخلاقی، مظاہر قانونی، اور مظاہر سیاسی، اس تقسیم کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ موصوف نے اس تقسیم میں بڑی ذہانت سے کام لیا ہے۔ اور جن حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے انھیں کوئی بھی رد نہیں کر سکتا۔ یہ بات قابل افسوس ضرور ہے کہ آگست کونت کے تتبع میں اندھی

لہ ملاحظہ ہوں گیوم دے گریف کی مندرجہ ذیل کتابیں :-

(۱) مقدمہ عمرانیات (۲) قوانین اجتماعی (۳) اجتماعی تبدیل حیثیت

تقلید سے کام نہ لیا گیا ہے۔ چنانچہ مذہب اور علم دونوں کو ایک ہی فصل کے تحت میں رکھا گیا ہے۔ دراصل آگست کونٹ کا تو یہ عقیدہ تھا کہ کچھ عرصہ بعد علم سائنس اذہب کی گدی پر برا بے گا۔ لیکن منصف موصوف کو اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ مذہب خالص علمی تحقیق سے ماسوا اپنا ایک مخصوص حلقہ اثر رکھتا ہے۔ جس کا بالکل دوسری شکل اور نوعیت سے سہل لے کیا جاسکتا ہے۔ گیوم کے گرفت نے جو مقولات یا تفصیلات قائم کی ہیں ان میں ہر کہیں یہ بات نمایاں ہے کہ بعض مظاہر کی تعیم دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ بلاشبہ یہ دعویٰ حق بجانب ہو گا کہ نظام سیاسی حیات عمرانی کے سب نظاموں سے زیادہ پیچیدہ ہے، اسوا سٹے کہ اس کی بناوٹ میں نظام معاشی، نظام ذہنی اور نظام اخلاقی سب کے اثر کی کارفرمائی موجود ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ نظام سیاسی میں مندرجہ صدر نظاموں کے مقابل میں تعیم کا عنصر کم پایا جاتا ہے؟ کیا ہم کسی ایسے معاشرہ کو اپنے تخیل میں لا سکتے ہیں جس میں نظام سیاسی موجود نہ ہو؟ جہاں کہیں نظام سیاسی موجود ہے وہیں اس کے دوش بدوش نظام خاندانی نظر آئے گا۔ اور اصل میں یہی نظام خاندانی بڑھتے بڑھتے آج نظام سیاسی کی شکل میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے۔ بعینہ اسی طرح یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ مظاہر اخلاقی بہ مقابلہ مظاہر صناعی اجتماعی زندگی میں کم عام ہیں۔ ان چند سیدھے سادے اعترافات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ پروفیسر موصوف کی دلچسپ کوشش میں کس قدر خیال آرائی کو راہ دی گئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ موسیو گیوم کے گرفت کے مندرجہ صدر نظر یہ میں آگست کونٹ کی تعلیمات کی جھلک صاف نظر آتی ہے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑی حد تک انھوں نے ہر برٹ اسپنسر

باب

کے خیالات کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ نظریہ عضویاتی کے متبعین نے ہر برٹ اسپنسر کی اندھی تقلید میں یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ حیات اجتماعی میں بھی ان تین اہم وظائف کو مد نظر رکھنا چاہیے جنہیں علم احویات نے انفرادی زندگی میں تحقیق کیا ہے یعنی عمل تغذیہ، عمل تولید اور عمل اختلاط۔ اجتماعی زندگی میں مظاہر معاشی کی وہی حیثیت ہے جو انفرادی زندگی میں جسم کے عمل تغذیہ کی۔ مظاہر معاشی کے پیش نظر پیدایش دولت، تبادلہ و تقسیم و صرف دولت کے مقاصد ہوتے ہیں۔ اجتماعی دولت وہی نوعیت رکھتی ہے جو نامی غذا یہاں اس جگہ ہم نے اصطلاحی الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں وہی مفہوم دینا چاہئے جو علماء عمرانیات و حیاتیات نے قبول کیا ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ دولت سے مراد وہ سب کچھ ہے جس سے زندگی اپنا تغذیہ و پرورش کر سکے۔ یہ دغیر موصوف نے مظاہر تولید کا ذکر کرتے وقت علم احویات کی اصطلاح استعمال کی ہے حالانکہ اس کی بجائے حیات اجتماعی کی مخصوص اصطلاح مظاہر خاندانی استعمال کی جاسکتی تھی۔ علاوہ بریں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اجتماعی زندگی میں عمل اختلاط کی دو جداگانہ نوعیتیں ہیں۔ اس کے تحت جو اجتماعی اعمال آتے ہیں ان میں بعض ایسے ہیں جن کا براہ راست ریاستی دخل اندازی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور بعض دوسرے ایسے ہیں جن میں ریاستی دخل اندازی موجود ہوتی ہے۔ یہ بات دنیا جانتی ہے کہ ریاست کل معاشرہ سے عبارت نہیں ہوتی۔ ریاست دراصل معاشرہ کی وہ شکل ہے جس میں حکومت و قوانین کی بدولت اتحاد مقصد پیدا ہو گیا ہے۔ ریاستی حدود سے باہر سگڑوں ایسے اجتماعی تعلقات ہیں جن میں ریاست کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ مثال

کے طور پر ان تعلقات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جو مذہب، اخلاق یا دینی باب اور متاعانہ اشتراک مذاق کی بدولت وجود میں آئے ہیں۔ ان تعلقات کی نوعیت قانونی اور سیاسی تعلقات سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ قانونی اور سیاسی تعلقات نہایت چھپے ہوئے ہیں اور ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں جبر کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ حیات اجتماعی کے عضویاتی نظریے کے متبعین کہتے ہیں کہ موخر الذکر تعلقات سے ہستی اجتماعی کی وحدت کا پتہ چلتا ہے۔

آئیے ان مذکورہ بالا خیالات میں سے ہم ان عناصر کو الگ چھانٹ لیں جن میں جانبداری کی بویائی جاتی ہے تاکہ ہمیں ایک ایسے تصور کے قائم کرنے میں آسانی ہو جس سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہ رہے۔ اس کے لئے ہمیں چاہیے کہ اجتماعی زندگی کے مظاہر خاندانی کو ایک علیحدہ مقولہ تسلیم کرنے سے انکار کریں۔ اگر آپ خاندان کی ان ذی حیات بنیادوں کو نظر انداز کر دیں جن کا تعلق عضویات سے ہے تو اس کی حیثیت مظاہر اخلاقی کی ایک فصل سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس دعوے کو بے چون و چرا مان لیں کہ مظاہر معاشی اجتماعی زندگی میں اعمال تغذیہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس دعوے سے دراصل مظاہر معاشی کی تعریف کرنے میں مطلق کسی قسم کی وضاحت کا اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ان کی حدود میں ایک طرح کی تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مظاہر معاشی اور دوسرے اعمال اجتماعی کی طرح عمل اختلاط سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تسلیم کر لینے سے مظاہر اجتماعی کی تقسیم میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف تو مادی زندگی کے حقائق سے سابقہ پڑتا ہے جنہیں ہم مظاہر معاشی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسری طرف مادی زندگی کے

حقائق ہیں جن میں بعض ایسے ہیں جو ریاستی دخل اندازی سے قطعاً مستثنیٰ ہیں مثلاً اخلاقی، ذہنی، صناعہ اور مذہبی مظاہر حیات۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا ریاست کے ساتھ جولی دامن کا ساتھ ہے۔ مثلاً قانونی اور سیاسی مظاہر۔ اب اگر ہم اس تقسیم کو تسلیم کریں تو ہماری تحقیق کے سارے اچھاؤں سلجھ جائیں۔ یہ تقسیم نہایت سادہ ہے۔ اسے بیان کرنے میں جانے بوجھے اور عام فہم الفاظ کے استعمال کے علاوہ کوئی نئی اصطلاحیں نہیں گڑھنی پڑیں۔ اس تقسیم کے ذریعہ سے صرف ان مطالب کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جنہیں عقل سلیم مدتوں سے برابر تسلیم کرتی چلی آتی ہے اور دنیا کی سب زبانیں ان سے بخوبی آشنا ہیں۔ کیا اس کو صحیح سمجھنے کے واسطے یہ سب باتیں کافی ضمانت نہیں ہیں۔

ہم نے ابھی اوپر ان مقولات کا ذکر کیا تھا جن کے ماتحت مظاہر اجتماعی ترتیب پاتے ہیں۔ اب ہم اس سلسلہ کو چھیڑتے ہیں کہ ان مختلف مظاہر اجتماعی کے درمیان ان مقولات کی رو سے کس قسم کا ربط پایا جاتا ہے۔

بالعموم لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ان مقولات میں سب سے

زیادہ حاوی اور جامع کونسا ہے۔ اس کے مختلف جوابات دیئے

گئے ہیں۔ عام طور پر ان جوابوں میں آپ کو دو متضاد رجحانوں کی

جھلک نظر آئے گی۔ ان سے ہماری مراد مادی اور تصویری رجحانات

ہیں۔ پہلے رجحان کے مطابق اجتماعی زندگی کی بنیادی حقیقت مادی

ہے اور دوسرے کے مطابق اس کی بنیادی حقیقت ذہنی ہے۔

کارل مارکس کا نظریہ پہلے رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نظریہ میں

یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ فطرت انسانی کی قدیم ترین احتیاجات معاشی

توہمت رکھتی ہیں چنانچہ ان احتیاجات کو پورا کرنے کے ذرائع ہم

پہنچانا اور پیدا ایش دولت کے آلات اختراع کرنا اجتماعی زندگی

باب

کے دوسرے مظاہر کو بھی ترقی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ انسانی فطرت باب ۳
کی یہ احتیاجات گویا ہماری حیات اجتماعی کی بنیادیں ہیں اور انھیں پورا
کرنے کے جو وسائل تلاش کئے گئے ہیں انھیں اس عمارت سے تشبیہ
دی جاسکتی ہے جو ان بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔

در اصل مارکس کو یہ نظریہ اس زمانہ میں سوچا تھا جب کہ خود اس
نے اپنی آنکھوں سے وہ تماشہ دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ کے قدیم طریقہ
پیداوار کی جگہ مشین نے لے لی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جرمنی اور
انگلستان میں گزارا تھا۔ ان دونوں ملکوں میں خاص کر صنعتی انقلاب
نے اجتماعی زندگی کی کایا لٹ دی۔ اس انقلاب سے جو اثرات
متربت ہوئے ان کی بھی مختلف نوعیتیں ہیں غرض کہ انھیں تمام حالات کو
دیکھ کر مارکس نے اپنے نظریہ کے عام قوانین کی تدوین کی جسے تاریخی
ماویت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مارکس کے نظریہ کے لئے یہ اصطلاح
اس لئے استعمال کی گئی کہ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسانی تاریخ
کا ارتقا زندگی کے مادی محرکات پر مبنی ہے۔ باوجود مارکس کے محمدانہ
زور خیال کے ہیں غالباً یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اس نظریہ میں کس قدر
انتہائی تنگ نظری اور جانبداری برتی گئی ہے۔ یہ نظریہ ہمارے خیال
میں اجتماعی زندگی کی ایک نہایت غیر مکمل تاویل پیش کرتا ہے۔ اول تو یہ
کہ آلات پیداوار اور طریقہ پیداوار میں دولت کو اتنی اہمیت نہیں دیتی
جتنی کہ وہ سارے مظاہر معاشی پر حاوی ہو جائیں۔ چونکہ گیوم دے کرٹ
نے اپنے تصورات کی وسیع ترکیب میں کارل مارکس کے نظریہ کو اچھی غلطی
اہم جگہ دی ہے اس لئے قدرتی طور پر وہ مظاہر معاشی میں تقسیم دولت
کو اجتماعی زندگی کا قدیم ترین مظہر ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ
دلیل بھی پیش کی گئی ہے کہ دولت کو صرف اس وقت اجتماعی خصوصیت
حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں نہ جاتی ہے
پھر بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ مظہر معاشی حیات اجتماعی کے

یا

۱۱

سب گوشوں پر حاوی نہیں ہے۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں کہ ادب، فنون لطیفہ اور علوم کی ترقی ایک حد تک معاشی ترقی پر منحصر ہوتی ہے لیکن اس کے اور دوسرے اسباب بھی ہیں جنہیں معاشی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم فلسفہ کے مختلف مسکوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ اپنے گرد و پیش کے استقدر تابع نہیں ہوتے جتنے کہ اور دوسرے مسکوں کے ساتھ ان کی وابستگی ہوتی ہے۔ غرض کہ اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مارکس کا نظریہ دراصل حقیقت اجتماعی کی ایک غیر قطعی بحث تاویل پیش کرتا ہے۔

آگسٹر کونٹ کا نظریہ مارکس کے نظریہ سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ ہم اس کو دوسری قسم کے تصور کی بہترین مثال قرار دے سکتے ہیں اس واسطے کہ وہ حقیقت ذہنی کو حیات اجتماعی کی اساس قرار دیتا ہے۔ کونٹ کھلم کھلا تصوریت کا حامی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ ہماری حیات اجتماعی کی بناوٹ خیال اور تجربہ دی علم کے مانے مانے سے ہوئی ہے۔ اجتماعی زندگی کی مختلف حالتوں کا تاثر انحصار انسان کے کائناتی تصور پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کونٹ نے انسانی تاریخ کو تین حالتوں میں تقسیم کیا ہے۔ دینیاتی حالت، البدنی

حالت، اور ایجابی حالت۔ انسانی معیشت کی پہلی دونوں حالتوں میں تو ہم وبت پرستی اور توحید کا دور دورہ رہا، پھر تیسری حالت جو عہد حاضر کے بعد وجود میں آنے والی ہے اس میں علوم کی تخصیص و تجزیہ اور ان کی ترقی کا زمانہ ہو گا۔ چنانچہ بقول کونٹ ایک زمانہ آنے والا ہے۔ جب کہ ایک ایسا فلسفہ رائج ہو گا جس میں انتراج و ایجاب کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہوں گی۔ اسے ہم عہد تیسیم سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عمران بشری کے ان مختلف دوروں میں آرٹ، سیاست اور فنون کی ترقی کا سارا دار و مدار علم و حکمت پر رہا ہے۔ ہم یہ اعتراف کرنے کو تیار ہیں کہ کونٹ کا نظریہ انسانی زندگی کے نہایت اعلیٰ النحل پر مبنی ہے اور اس میں بعض ایسے

اجزا بھی ہیں جو صداقت کی کوئی پرپورے اترتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی واضح بات کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آگست کو نت نے اپنے اس نظریہ سے جو بعد از قیاس نتائج نکالنے چاہے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ ابھی ہم نے یہ کہا تھا کہ فلسفہ کو اجتماعی زندگی کے منظر معاشی سے قطعاً دور کی تصور کرنا چاہیئے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ آرٹ، سیاست اور فنون کو علم و حکمت کے اثر سے آزاد تصور کرنا چاہیئے۔ بھلا ماہر موسیقی کے اجتہاد، مدبر سیاسی کے داؤں گھات اور کاشتکاری یا صنعت صرقت میں انہماک رکھنے والے کو طبعی کے معطل یا مفکر کے حجرہ سے کیا واسطہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ معاشرہ کی حیات اجتماعی میں ذہنی عنصر کی کار فرمائی بہت محدود ہے۔

اس بحث و نظر نے اب ہیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ مظاہر اجتماعی کے ایسے مقدمات نہیں ترتیب دئے جاسکتے جن کے تحت میں عمران بشری کے سارے مظاہر آجائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ نتیجہ نکالنا بھی صحت سے بعید ہوگا کہ حیات اجتماعی کے مختلف مظاہر میں باہم کوئی ربط و تعلق ہوتا ہی نہیں ہمارا تو خیال یہ ہے کہ یہ سب مظاہر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں۔ مثال کے طور پر اجتماعی زندگی کے ایک منظر جنگ کو لیجئے۔ جنگ دراصل خالص سیاسی منظر ہے۔ بالعموم یہ دو یا متعدد اقوام یا ان کی حکومتوں کی باہمی عداوت کے باعث وجود میں آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جنگ کو معاشی اہمیت بھی حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ بین الاقوامی منڈیوں میں پیداوار کے مقابلہ کی وجہ سے وہ وجود میں آئے۔ پھر جنگ کی ذہنی نوعیت بھی ہے۔ دو تہذیبوں، دو مختلف ذہنیاتوں یا دو زبانوں کے باہمی اختلاف سے بھی جنگ تک ذہنیت پہنچ سکتی ہے۔ آپ کو شاید یہ دیکھ کر تعجب ہو کہ بعض ایسی باتیں جن کا ربطا ہر جنگ سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا محاربین میں جوشن و ولولہ پیدا کرنے کا کام دیتی ہیں۔ جنگ کی حالت میں محاربین آرٹ، مذہب، اخلاق اور قانون سب

باب

کو بطور حلوں کے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ جنگ جیسے المناک منظر اجتماعی میں بھی ہر قسم کے دوسرے مظاہر اجتماعی موجود رہتے ہیں۔ جنگ کے علاوہ آپ کسی اور اجتماعی زندگی کے گوشہ کو لیجئے۔ مثال کے طور پر کسی ماتحت عدالت کے کسی ایک مقدمہ کا جائزہ لیجئے جہاں تک کہ طریقہ کار کا تعلق ہے اس مقدمہ کا تعلق قانون سے ہوگا لیکن اگر آپ اس کے سب عناصر کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ کی اصلی نوعیت اخلاقی ہے اکثر اوقات جانبدار کے اعمال کا اصلی محرک منظر معاشی ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات سیاسی اثرات کا نفوذ پایا جائے۔ پھر ماہرین سائنس کو بھی کبھی کبھی اپنی رائے سے اس میں دخل دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہاں تک کہ جیل خانہ کے پرہیز کی صورت میں مذہب کو بھی بار مل سکتا ہے۔ اگر کوئی مصوٰہ اس مقدمہ کی کارروائی کی تصویر کھینچے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرٹ کو بھی اس کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہو گیا۔ غرض کہ ہمارے اس کہنے کا اصلی نشاء یہ ہے کہ حیات اجتماعی میں ہر لمحہ آپ مختلف نوعیت رکھنے والے عناصر کے اتحاد و تعامل کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کبھی ایک عنصر غالب نظر آتا ہے اور کبھی دوسرا ان میں سے کسی سے چشم پوشی کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر عنصر بجائے خود عمران بشری کی ناگزیر ضروریات کا ترجمان ہوتا ہے۔

اب ہیں اس امر کا پتہ لگانا باقی ہے کہ آیا ہم نے جو مختلف عناصر کا تجزیہ پیش کیا اس کی کوئی معروضی حقیقت بھی ہے یا نہیں؟ ہماری گفتگو سے یہ تو یقیناً مترشح ہو گیا ہوگا کہ یہ سب عناصر اپنا علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ابھی یہ کوشش کی کہ ان کے درمیان ایک قسم کا رابطہ و تعلق ثابت کریں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم کو اس کا حق حاصل بھی ہے یا نہیں؟ ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ طریقہ تحقیق درست نہیں ہے پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ہم نے

جو مقولات (Categories) قائم کئے ہیں ان کی کوئی معروضی اصلیت ^{باب ۳} ہی سرے سے نہ ہو۔ بہر نوع اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی اجتماعی زندگی حرکت سے عبارت ہے اور اسکے اعمال اپنی ظاہری خصوصیت کے اعتبار سے معاشی یا اخلاقی یا سیاسی نوعیت رکھتے ہیں، غرض کہ ہر حالت میں اس کے اعمال کا تعلق معاشرہ سے ہے۔ وہاں ہم نے جو ان میں فرق و امتیاز قائم کیا ہے اس کی نوعیت موضوعی ہے، یہ امتیازات ہمارے عقل و فکر کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ان میں ایک طرح کا تشعشع پایا جاتا ہے۔ اسے دور کرنے کی بس ایک ہی صورت ہے کہ ان حقائق فکری کا ہماری جانی پہچانی اشیاء کے ساتھ ربط قائم کر دیا جائے، علم کی یہ خصوصیت ہے کہ جس چیز کی ماہیت وہ جاننا چاہتا ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ حیات اجتماعی کے تجزیہ کا مطلب یہی ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے اجزائیں تحلیل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ علم ایک حقیقت سے بہت سارے حقائق پیدا کرتا ہے لیکن اس سے اس کی غرض سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ بعد میں ایک ہمہ گیر وحدت کی تشکیل کرے۔

لے ہم نے یہاں مظاہر اجتماعی کی اٹھ تفصیر کا ذکر نہیں کیا جو ”سانائٹہ عمرانیات“ نے قبول کی ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے:۔ عمرانیات مذہبی، عمرانیات اخلاقی و قانونی، عمرانیات تفسیری، بشمول اعداد و شمار، اطلاق، عمرانیات معاشی، علم ترکیب عمرانی، متفرقات (زبان اثرات)۔ ہیں اس تقسیم پر اعتراض ہے۔ اول تو یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ اطلاق اور قانون کو ایک مد کے تحت میں رکھا جائے اور قانون میں سیاست کو ضم کر دیا جائے۔ پھر قانون، تفسیری اور قانون سول کو جدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ علاوہ بریں ”متفرقات“ کی مد میں جو اصل بنے جوڑ عناصر اکٹھا کر دیئے گئے ہیں انھیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس تقسیم میں جن ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ بھی نرالی ترتیب ہے۔ عمرانیات مذہبی کو سب سے پہلے سوا سطح رکھا گیا ہے کہ موافق رسالہ ہذا کا خیال ہے کہ تہذیب انسانی کی (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

تیرھواں باب

ارتقاءِ اجتماعی | معاشرہ کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کبھی سکون کی حالت میں نہیں رہتا۔ اس کی ساخت میں خود اس کے وظائف کے اثر سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ انھیں تبدیلیوں اور ارتقاء کی کیفیت کی وجہ سے عمران بشری کے مسائل کی پیچیدگیاں اور ابھراؤ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ابتدائی صورت مذہبی رنگ میں ظاہر ہوئی۔ لیکن شاید انھوں نے اس حقیقت سے جنم پوشی کر لی کہ مذہب اس پھول کے مانند ہے جو اخلاق اور قانون کی مضبوط ٹہنی پر کھلتا ہے اور جس کی آبیاری معاشیات کی جڑوں سے ہوتی ہے۔ علاوہ بریں دظالیم اجتماعی کا ذکر اس وقت تک بے سود ہے جب تک کہ اس ڈھانچے کی شکل نہ پیش کی جائے جس سے یہ وظائف ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ”سائنسائے عمرانیات“ میں اس کے لئے ”اجتماعی ساخت“ کی اصطلاح کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس تعبیر کی مثال اس مخروطی شکل کی سی ہے جس کے اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر ہو گیا ہے۔ اب ہم اس بحث کو زیادہ طول دینا بہکار سمجھتے ہیں اس لئے بس ان اشارات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ”سائنسائے عمرانیات“ کے مؤلفین کو خود اس امر کا اعتراف ہے کہ انھوں نے جو یہ تقسیم کی ہے اس کی غرض یہ ہے کہ عمرانیات پر جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں ترتیب دینے میں سہولت ہو۔ چنانچہ اگر اس تقسیم کا منشاء صرف اتنا ہے تو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

باب

پیدا ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے ہیں اس امر کی تحقیق کرنی چاہئے کہ اس ارتقائی کیفیت کا اصلی سبب کیا ہے، صرف اتنا کہ دینا کافی نہیں ہے کہ معاشرہ میں اعضائے عمرانی کے باہمی تعامل سے یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی مشین چلتی ہے تو وہ ٹھوڑی بہت تھستی ضرور ہے لیکن حیات اجتماعی کی مشین کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ باوجود شکست و ریخت وہ دیسی کی دیسی صحیح سالم رہتی ہے بلکہ آپ دیکھیں گے کہ بالعموم وہ جتنی زیادہ چلتی ہے اتنے ہی اس کے نقائص دور ہوتے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ معاشرہ میں یہ خصوصیت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں اگر ہم دو اسباب کی شک پہنچ جائیں تو اس امر کی تصریح ہو سکے گی۔ اول تو ہمیں ارتقائی کیفیت کے اصلی محرک کی نسبت علم ہونا چاہئے اور دوسرے اس مخصوص شرط کی کار کا کھوج لگانا ضروری ہے جس کے توسط سے ارتقاء عمل میں آتا ہے۔

مطلوبہ اجتماعی زندگی کی ارتقائی کیفیت کا حقیقی محرک انسان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنی حالت کو دن بدن سدھارے۔ انسان کی ہمیشہ سے یہ آرزو رہی ہے کہ وہ اپنی زندگی بہتر سے بہتر حالت میں بسر کرے۔ اور دوسرے جانداروں کی طرح، بقول اسپینوزا، انسان اپنی موجودہ حالت پر صبر و شکر نہیں کرتا بلکہ وہ منت نئے انداز سے اپنی زندگی کو وسیع تر اور بلند تر بنانے کا سہمی رہتا ہے۔ کائنات فطرت کی ساری

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ہم اس رسالہ کے مؤلفین کو یقیناً قابل معافی سمجھتے ہیں اور انہیں اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ اپنی اس زبردستی کی تقسیم کو باقی رکھیں تاکہ علم عمرانیات کے مواد کو ترتیب دینے میں آسانی ہو۔ یہ تقسیمیں وہی ہی سمجھے جیسے کسی کتب خانہ میں کتابوں کو ترتیب سے رکھنے کے لئے انہیں مختلف مغایلوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

بابت

ذی روح مخلوق میں صرف انسان ہی تنہا ہے جس میں آپ یہ صفت پائیں گے۔

ارتقا کی منزلیں طے کرنے کے لئے انسان نے عقل کی ترقی کو اپنا رہبر بنایا ہے اور دوسرے جانداروں کے مثل انسان بھی یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے گرد و پیش کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرے لیکن اس کی یہ جدوجہد اپنا ایک اٹکھانہ انداز رکھتی ہے۔ بالعموم وہ یہ کام اپنے ذہن سے لیتا ہے۔ حیوانات جب اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کی یہ کوشش اضطرابی اور وجدانی نوعیت رکھتی ہے برخلاف اس کے انسان قدم قدم پر عقل و تفکر کی روشنی ڈھونڈتا ہے اس کے ارادہ کی باگ دراصل اس کی قوت فکر و امتیاز کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی میں یہی ماحول سے مطابقت کی کوشش ملحوظ اپنے اثر کے بڑی وسعت اختیار کرتی ہے اور اسی کی بدولت انسان اپنے نفس پر اعتماد کرنا سیکھتا ہے۔ پھر اسے اس کا بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے نفس کے پھیلاؤ کی کوئی حد نہیں ہے۔ فرد بشر حیوانات کے مثل اپنے ماحول کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی جگہ اپنے عمل کی بے پناہ زد سے اسے ہر لمحہ مجروح کرتا رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ گرد و پیش کا اثر اس کی فطرت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی توجہ ہے کہ وہ بھی ماحول کی حیثیت کو بدلنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

عقل انسانی کی تخلیق کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس میں پھیلنے اور بڑھنے کی بہت صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صد ہا سال سے ایجادوں کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ایک ایجاد سے دوسری ایجاد اس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے جیسے ایک دیے سے دوسرا دیا روشن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تصورات کی تعداد جو عمر ان بشری کی ہدایت کرتے ہیں، وہ روایات جن کی انسان پیروی

کرتا ہے اور وہ اشیاء جنہیں وہ برتنا ہے ان کی تعریف میں برہم پھر ردز بائلا اضافہ ہو رہا ہے۔ گہرے تاروں نے سرمایہ کی باہمت پر بحث کرتے ہوئے اس کی یہ تعریف کی ہے کہ تعدہ ہماری پے در پے ایجادوں کے مجموعے سے عبارت ہے۔ اس تعریف کی صحت میں مطلق کوئی کلام نہ رہے اگر ہم اس میں اتنا اور اضافہ کر دیں کہ یہاں ایجاد سے مراد ہیں انسانی اعمال کے وہ نتائج جن کی محسوس حیثیت ہے۔ پھر ہمیں اپنے ذہنی سرمائے اور مادی سرمائے میں فرق کرنا چاہئے۔ غرض کہ ہم نے دیکھا کہ اصولی طور پر یہ دعویٰ قابل تسلیم ہے کہ انسان نے اپنے علم نظری و عملی کے خزانے کو ہر زمانے میں بڑھایا ہے اور اس کے اعمال و وسائل معاش میں برابر ترقی ہوئی رہی ہے۔

البتہ ہمیں اعتراف ہے کہ مذکورہ بالا اصول کو مطلق نہیں کہا جاسکتا۔ ہم نے ابھی جس کلیہ کا ذکر کیا ہے اس میں بعض مستثنیات کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ من حیث المجموع تمدن بشری کی رفتار ترقی کی جانب مائل ہے لیکن ہر منٹ میں عذر نہ ہونا چاہیے کہ اسے روکاؤں سے بھی سابقہ پڑتا ہے اور ابھی کبھی اُلٹے پاؤں واپس ہونے تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اب اس پر غور کرنا چاہئے کہ ایسا ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ بعض وقت آپ دیکھیں گے کہ انسان کے ذہنی قومی اشل ہو جاتے ہیں اور اس کی عقل و فکر کی پرواز بلندیوں تک جانے سے گریز کرتی ہے۔ کبھی اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک غیر مہذب انسانی گروہ اپنے سے زیادہ تمدن معاشرہ کو اپنی چیرہ دستیوں کا نشانہ بناتا ہے۔ چنانچہ چینی تمدن کی بے حرکت پر پلا سبب صادق آتا ہے اور پانچویں صدی عیسوی میں رومنہ الکبریٰ کے تمدن کے تروبالا ہونے پر دوسرا سبب موثر نظر آتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسانی جماعتوں کا انحطاط کس قانون کے تابع ہے؟ اس قانون کے وضع کرنے کی متعدد دہاؤں کو شش ہو چکی ہے

بابت

مگر آج تک پورے طور پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ فرانسیسی مفکر تین نے خاصکر اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ بنیث اجتماعی مختلف قالب تھیں مگر اختیار کرتی ہے؟ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ایک سیاسی نظام جو مخصوص حالات کے ماتحت وجود میں آتا ہے اگر وہ حالات بدل جائیں تو وہ نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نظام کی اوپری تھیں پہلے ٹینگی اور نیچے کی بنیادی تھیں کچھ دنوں تک مقابلہ کریں گی پھر وہ بھی ختم ہو جائیں گی چنانچہ بالعموم یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انسانی تہذیب کی قدیم بنیادیں جو زندگی کی گہرائیوں تک پہنچی ہیں عمران بشری کے وسطے انکا جو در زیادہ ناگزیر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں سٹائی جاسکتیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاشرہ کے متے ہوئے جماعتی اداروں کو رجعت پسندی سے از سر نو زندہ کیا جاسکتا ہے چنانچہ رومی شہنشاہی کے زوال پر دیسی چھوٹی چھوٹی خود مختار شہری ریاستیں نہیں وجود میں آئیں جس طرح یونان میں یا اٹلی میں ساتویں صدی عیسوی میں موجود تھیں برخلاف اس کے بڑے بڑے وسیع رقبوں والی مملکتیں تشکیل پذیر ہوئیں جن کے بطن سے ہمارے موجودہ یورپ نے جنم لیا ہے۔ دوسرے فرانسیسی حکیم تار دکا بھی یہ خیال ہے کہ ایک دفعہ جو نظامات قائم کئے جاتے ہیں وہ پھر سے از سر نو کبھی نہیں قائم کئے جاسکتے۔ وہ اپنے اس نظریہ کو اصول لاجعہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ دنیا کا کوئی معاشرہ بھی یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اپنے ماضی کو دوبارہ وجود میں لاسکے۔ اگر بغرض محال یہ رجعت ممکن ہو تو بھی معاشرہ کی ارتقائی زندگی میں ایسے عناصر بدستور رہیں گے۔ جو اس کی موجودہ حالت کو ماضی سے مختلف رکھیں گے۔ ہیں تار دکے اس اصول کو تسلیم کرنے میں مطلق پس و پیش نہ ہو اگر ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رہے کہ معاشرہ کی موجودہ حالت میں ایسے عناصر بھی بکثرت ہوتے ہیں جو اس کی قدیم حالت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ غرض کہ اس مسئلہ کو مختلف نوعیتوں سے جانچا جاسکتا ہے اور

ہماری رائے میں ایسا کلیہ وضع کرنا جو سب حالات پر حاوی ہو بڑی جرأت کا کام ہو گا۔ اس اصول رجعت کے سلسلہ میں اس کا بھی ذکر کر دیں کہ بعض اہل فکر کا خیال ہے کہ معاشرہ اپنی قوت ارادی کے بل پر اپنے باطنی کو واپس لا سکتا ہے۔ ملک پولستان کے دو ماہرین عمرانیات پال و لینگروں اور کاسمیر دے ٹکسکوز نے جن سے فرانس میں غالباً بہت کم لوگ واقف ہوئے۔ اجتماعی زندگی کی اس خاص حالت کے لئے انقلابی باطنی پرستی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ انقلابی زمانوں میں بعض ملک قدیم اداروں کو از سر نو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے موقع پر قدیم رومی عاقلین کو پھر سے برقرار کیا گیا اور دستور اساسی میں کونسل ٹریبیون اور سینٹ کے الفاظ بھی جان بوجھ کر اسی واسطے داخل کئے گئے۔ عود شاہی کے وقت انقلاب سے پہلے کے اداروں کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش ہوئی۔ جمہوریت ثانی نے جمہوریت اولیٰ کے اداروں کی نقل کی اور اسی طرح شہنشاہیت ثانی نے شہنشاہیت اولیٰ کے نظامات کا ہو بہو چرہ اُتارنا چاہا۔ مذکورہ صدر مسائل کو اگر ہم اس مخصوص نقطہ نظر سے دیکھیں تو ان کی نوعیت بڑی حد تک محدود ہو جاتی ہے لیکن اگر ان سب کے واسطے ایک عام کلیہ وضع کیا جائے تو اس کی مدد سے مدارج ارتقاء کی مجموعی تصویر کے خدوخال بخوبی نظر آجائیں گے۔

ہم نے ابھی جس اجتماعی تصور کا ذکر کیا اس کے مطابق ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حیات اجتماعی کی قدیم مٹی ہوئی شکلیں کیونکر کبھی کبھی نہیں اپنا جلوہ دکھا دیتی ہیں۔ علماء عمرانیات نے اس تصور کے مختلف پہلوؤں پر بحث و نظر کی روشنی ڈالی ہے جس کا جائزہ لینا ہمارے لئے ازیں ضروری ہے۔ آگست کونت کا اس باب میں وہی خیال ہے جو اس کے استاد ہنری دے سینٹ سیمون کا تھا۔ یعنی یہ کہ تاریخ انسانی میں دو ایسے متضاد عہد پہلو بہ پہلو ایک دوسرے کے بعد آتے دکھائی

۱۳

دیتے ہیں جن میں ایک کو ہم بھی اور دوسرے کو تنقیدی کہہ سکتے ہیں۔ اول الذکر میں حیات اجتماعی ایک خاص طرح کی شکل اختیار کرتی ہے اور دوسرے عہد میں وہ برٹ جاتی ہے چنانچہ ہم ازمنہ وسطیٰ کو عہد تنظیمی اور نشاۃ ثانیہ سے لیکر انقلاب فرانس کے زمانہ کو عہد تنقیدی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب ہمارے زمانہ میں ایک نئے عہد تنظیمی کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ اسی قسم کا ایک قانون بربرٹ اسپنسر نے بھی وضع کیا ہے جسے وہ قانون توازن کہتا ہے۔ اس کا دعوے تھا کہ یہ قانون محض عالم عمرانی ہی تک محدود نہیں بلکہ کائنات فطرت میں موثر ہے اس قانون کے مطابق عروج و زوال اور انقباض و انتشار باری باری سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دراصل یہ قانون نتیجہ ہوتا ہے ایک طرف مادے کے سننے اور دوسری طرف حرکت کے پھیلنے کا اور پھر مادہ کے پھیلنے اور حرکت کے جذب ہونے کا۔ ان اصطلاحوں کی جگہ ہم اور دوسرے الفاظ ان مطالب کو ادا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں جن سے اجتماعی میکائینٹ اور طبیعی میکائینٹ میں ایک قسم کا ربط پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے اسپنسر اور کونٹ کے نظریوں میں زیادہ فرق باقی نہیں رہے گا۔

دولوں نے انسانی تاریخ کو جوڑوں میں تقسیم کیا ہے ان دونوں کے علاوہ انسانی حکیم ہیگل کا یہ کہنا ہے کہ انسانی تاریخ تین دوروں میں سے ہو کر گزرتی ہے جو ایک دوسرے کے بعد آیا کرتے ہیں۔ یعنی اثبات، نفی اور ترکیب۔ بقول ہیگل یہ قانون عمران بشری اور کائنات فطرت دونوں پر مساوی طور پر عاید ہوتا ہے اور ابدی منطق بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس قانون کا عمل باری باری حسب ذیل طریقہ سے ہوتا ہے:-

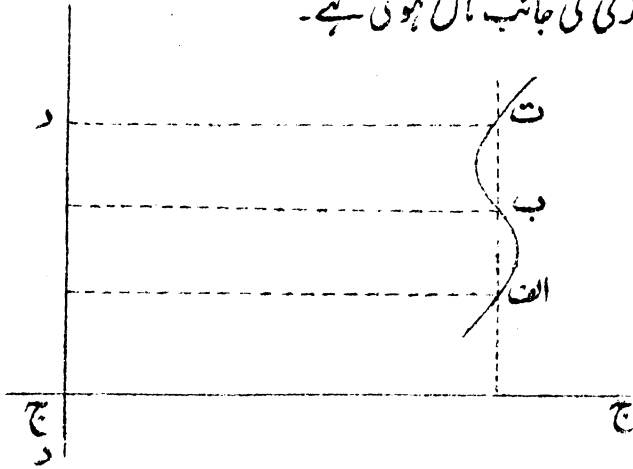
ایک تمدن قائم ہے یہ اثبات ہوا۔ اس تمدن کے وجود میں آتے ہی لوگوں میں بے چینی شروع ہو جاتی ہے اور وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ وہ تمدن درہم برہم نہ ہو جائے، مخالفین کو غلبہ

نصیب ہوتا ہے، یہ ضد نفی ہوئی۔ قدیم روایات کے پرستاروں میں پھر باب ۳
ازسرو عمل کا دلولہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنی جدوجہد کی بدولت ان کی بعض خوشیوں
تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک امتزاجی تمدن وجود میں آتا ہے۔ یہ
تیسرا دور ہوتا ہے۔ اس امتزاجی تمدن کے قایم ہونے کے ساتھ پھر وہی
تین دوروں والا ارتقائی چکر شروع ہو جاتا ہے۔ ہم ان تینوں دوروں کو
عالم اجتماعی کی اصطلاح میں عمل رد عمل اور نتیجہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان
دوروں کی بہترین مثال ہمیں فرانسیسی قوم کی ایک صدی پہلے کی تاریخ میں
ملتی ہے۔ پہلے قدیم حکومت تھی، پھر انقلاب ہوا، پھر شہنشاہیت اولیٰ
قایم ہوئی، پھر عودتِ شاہی اور پھر جولائی والی بادشاہی۔

سہیل کا خیال تھا کہ امتزاجی دور پہلے دونوں دوروں کے مقابلہ
میں زیادہ مائل بہ ترقی ہوا کرتا ہے۔ آگست گونت کا بھی یہی عقیدہ تھا
کہ عہد تنظیمی اپنے قابل عہد کے مقابلہ میں درمیانی تنقیدی عہد سے مستفید
ہوتا ہے۔ ہر برٹ اسپنسر کا نظریہ بھی اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔
ایک فرانسیسی ماہر عمرانیات راول دے لاگراسری نے جن کا انتقال ہو گیا،
اپنی کتاب ”ارتقائی تربیتی شکل“ میں مختلف اجتماعی نظاموں کی قدر مشترک
نقطے متعلق نہایت دلچسپ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ موصوف دیگو کے
اس باب میں ہم خیال معلوم ہوتے ہیں کہ فطرت جگر کاٹ کر پھر دیں بیج
جاتی ہے جہاں سے جلی تھی۔ فرانسیسی مفکر نے اس خیال پر اتنا اور اضافہ
کیا ہے کہ فطرت کا ہر جگر دراصل ترقی کی ایک منزل ہوتی ہے۔ اس کے
نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے کہ ارتقاء کی رفتار ہمیشہ خط مستقیم کے مثل
ہوتی ہے۔ اور وہ دیگو کی اس رائے کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ ارتقاء بالکل
دائرہ کی پابندی کرتا ہے، ایسا کہنا بھولے پن پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا
دعویٰ یہ ہے کہ ارتقاء خط منحنی بناتا چلتا ہے (ملاحظہ ہو اگلے صفحہ کی تربیتی شکل)

باجل

ہر موڑ پر انسانیت اپنے ارتقاء کے ایک نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ اس تریسہ شکل میں آپ دیکھیں گے کہ (د، ب، اور دت) اسی خط عمودی پر واقع ہیں جس پر (الف) جو دراصل نقطہ ابتدا ہے۔ مگر افقی طور پر آپ دیکھیں تو یہ دونوں نقطے (الف) سے زیادہ بلند ہیں۔ ان کے درمیانی فاصل میں اثبات اور نفی، تنظیم اور عہد تنقید، انضباط اور انتشار کی قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہیں۔ بطور نتیجہ ترکیبی کیفیت پیدا ہوتی جو باوجود لغزش و رجعت مجموعی طور پر ترقی کی جانب نائل ہوتی ہے۔



ہم نے ابھی اوپر جن نظریوں کا ذکر کیا ہے انہیں عمرانیاتی تحقیق میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہر نظریہ کی تائید میں تاریخ انسانی کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ ہمیں تسلیم کرنے میں مطلق عذر نہیں ہے کہ ان سب نظریوں میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ ان نظریوں میں ایک بھی ایسا نہیں جسے صداقت کلی کے طور پر ہم مان لیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسانی ارتقاء کی بولمبونی اور پیچیدگی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے ایک سادہ ضابطہ کے تحت میں لے آئیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ عمل ارتقاء

ہر جگہ ایک اصول کے مطابق نہیں ہوا۔ اس کی ماہیت سمجھنے کیلئے ہمیں مختلف عہدوں، مختلف ملکوں اور مختلف نظاموں کی نوعیت کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔ چنانچہ جس عہد، جس ملک اور جن واقعات کی تحقیق مطلوب ہے، ان کی مناسبت سے ہمارے سامنے تاریخ انسانی اپنے نئے نئے اور انوکھے رویوں کی نقاب کشائی کرے گی پھر آپ دیکھیں گے کہ ان سب رویوں کو متعارف اصول و ضوابط کے تحت میں لانا ناممکن ہے۔ اس سے ہمارا منشاء یہ ہرگز نہیں کہ عمرانیات کے جن اصولوں کی ہم نے تشریح کی وہ محض بے کار ہیں۔ بہ خلاف اس کے علوم عمرانی پر آپ کو جس قدر تجربہ حاصل ہوتا جائے گا اسی قدر آپ کو اس حقیقت کا احساس ہو گا کہ بعض اصول ان میں سے واقعات پر ایسے چسپاں ہوتے ہیں جیسے چسپاں ہونے کا حق۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ کبھی ایک اصول عاید ہوتا ہے اور کبھی دوسرا۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے جو اصول وضع کیے ہیں وہ کما حقہ مکمل اور حاوی نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمیں ان بہت سارے واقعات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو ان اصول میں سے کسی کے تحت نہیں آتے محقق کی حیثیت سے جاننا فرض ہے کہ ہم اجتماعی زندگی کے ان سب واقعات کے سلسلہ حقوق محفوظ رکھیں جو ہماری عقل اور ہمارے علم کے دائرے سے باہر ہیں۔

مذکورہ بالا بحث و تمحیص سے یہ بات تو یقینی طور پر صاف ہو گئی کہ ارتقاء کے معنی ہمیشہ ترقی کے نہیں ہوتے۔ ارتقاء ایک خاص علمی اور غیر جانبدار اصطلاح ہے اس کے مفہوم میں کسی عمل کی اچھائی یا برائی کی نسبت کوئی فیصلہ شامل نہیں ہے۔ اس کے برعکس لفظ ترقی ہمیشہ اچھے منوال میں آتا ہے۔ چنانچہ بہت سی ارتقائی حالتیں ایسی ہیں جن میں ترقی کا فدا سا بھی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ پھر ترقی کے ساتھ رکاوٹوں کے دفعے اور رجعت لازم ہوتی ہے۔ ترقی کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ

باب

مقامی اور غیر مکمل ہوتی ہے۔ ہم عرف عام میں جسے قومی ترقی کہتے ہیں، چاہے وہ حکمت عملی کے میدان میں ہو یا صنعت و حرفت میں، وہ دراصل دوسری قوم کے اخطا طے سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کی زندگی کے ایک شعبہ میں ترقی ہو رہی ہو اور باقی دوسرے شعبے رو بہ اخطا طے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فوجی تنظیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کسی قوم میں جنگجوئی اور بربریت کے خزانہ فضاں پیدا ہو جائیں۔ ترقی کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں اور یہ کچھ ضروری نہیں کہ ان میں باہر گر کوئی تعلق موجود ہو۔ ہم یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آیا اخلاقی ترقی کا جسے بلاشبہ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، ذہنی اور مادی ترقی کے ساتھ کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی اخلاقی زندگی کی بھی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ تاریخ عالم میں بہت سارے ایسے مستثنیات موجود ہیں جو اس قیلے کے تحت نہیں آتے۔

اب آخر میں اس کی توضیح کر دینی چاہئے کہ لفظ ”ترقی“ سے کیا مراد ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ اقدار حیات کی بحث دراصل ایک موضوعی بحث ہے۔ چنانچہ لفظ ”ترقی“ کے معنی کی بھی موضوعی حیثیت ہے۔ دراصل ہم معائنہ کی اس رفتار کو ترقی سے تعبیر کرتے ہیں جس کا رخ خود ہمارے ذاتی نصب العین کی طرف ہو۔ یہ نصب العین ہمیشہ شخصی ہوا کرتا ہے۔ اور اس کی کوئی ضمانت نہیں کیجا سکتی کہ وہ حقائق پر مبنی ہو گا۔ چنانچہ اس نصب العین کے عین میں جو اختلافات نظر آتے ہیں ان کی بنا پر بعض وقت خود اس کے وجود میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ ہر شخص ترقی کی ایک جداگانہ تاویل پیش کرتا ہے۔ اس بارے میں لوگوں کے اختلاف کی حالت یہ ہے کہ ایک کے نزدیک جو ترقی ہے وہی دوسرے کے نزدیک اخطا طے ہے۔ سیاست

میں آپ آئے دن یہ دیکھتے ہیں کہ ایک سیاسی جماعت جن ذرائع کو مفید باندھ
اور مال بہ ترقی سمجھتی ہے دوسری سیاسی جماعت انھیں کو سخت مضر اور
مال بہ رجعت خیال کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ کس طرح حل
کیا جائے؟ اس کے متعلق مفصل چھان بین کرنا ہماری اس کتاب کے
حدود سے باہر ہے، یہاں ہم بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ معیشت
انسانی کے مختلف شعبوں میں جو اقوام سب سے آگے آگے ہیں اور
انھوں نے عام طور پر ترقی کے جن معیاروں کو تسلیم کیا ہے، انھیں کو ہم بھی
تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم ان ارتقائی حالتوں کو ترقی سے تعبیر کریں گے
جن کا رجحان بنی نوع انسان کے بیشتر حصے کو مادی ذہنی اور اخلاقی
آسودگی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ سب ارتقائی
حالتیں رحمتی ہیں۔ جو انسان کو ان نعمتوں سے محروم کرتی ہیں۔ عالم
عمرانیات کو اگر ایسی صورت حالات سے سابقہ پڑ جائے جب کہ وہ خود
مذکورہ صدر معیاروں پر عقیدہ قائم نہ کر سکے یا ان کے نفس وجود پر
اختلاف آرا رہتا ہو تو ایسی صورت میں اس کے لئے بہترین طرز عمل
یہ ہوگا کہ وہ ان واقعات کی اچھائی برائی کی نسبت کوئی فیصلہ نہ دے
جو معرض بحث میں ہیں۔ اس کا فرض بس اتنا ہے کہ وہ واقعات کو ٹھیک
ٹھیک پیش کر دے۔ اس کا منصب یہ نہیں کہ وہ ان کے خیر و شر کے
متعلق اپنی رائے دے۔ ٹھیک علمی طرز عمل کی نشان دہی چاہئے ہیں
اس میں شبہ ضرور ہے کہ ایسا کرنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ہم علماء
عمرانیات کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بھولے سے بھی لفظ ترقی کو اپنی زبان
پر نہ لائیں۔ وہ اپنا کام لفظ ارتقا سے بخوبی چلا سکتے ہیں۔

چودھواں باب

عمرانیات کا طریقہ تحقیق | ہم پچھلے ابواب میں ان مسائل کا ذکر کر چکے ہیں جو عمرانیات کا موضوع کہے جاسکتے ہیں جیسا کہ ہماری بحث سے ظاہر ہو گیا ہو گا یہ واقعہ ہے کہ عمرانیات ابھی تک اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ ان سب مسائل کی نسبت خاطر خواہ حل پیش کر سکے۔ ابھی عمرانیات کو جو دین آئے دن ہی کتے ہوئے ہیں کہ ہم اس سے اس قسم کی توقع قائم کریں۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ عمرانیات نہایت سرگرمی سے اپنے منہا کے مقصد کی تکمیل میں کوشاں ہے۔ اس باب میں ہم یہ بتلائیں گے کہ وہ یہ کام کس طرح پر کر رہی ہے۔ اور اس نے اس کے حصول کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب ہم عمرانیات کے طریقہ تحقیق کی نسبت چھان بین کریں گے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان علوم کو الگ الگ واضح کر کے بیان کریں جنہیں عام طور پر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ الجھا دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں ان علوم کی امتیازی خصوصیات کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ان علوم سے ہماری مراد ہے مخصوص

علوم عمرانی، عمرانیات اور عمرانی فنون۔ اول الذکر حقیقت عمرانی کے خاص باب ہے بلکہ اس پر روشنی ڈالنے ہیں، عمرانیات حقائق عمرانی کے کلیات وضع کرتی ہے اور آخر الذکر کے پیش نظر یہ نصب العین رہتا ہے کہ موجودہ عمرانی حالت کو سدھا رہا جائے۔ چنانچہ یہ تینوں علوم اپنی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تحقیق کے جداگانہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ پہلے ہم مخصوص علوم عمرانی کے موضوع کی تشریح کر دیں۔ اس جگہ ہم ان سب علوم کی کل فہرست نہیں درج کرنا چاہتے جو ان کے تحت بن سکتے ہیں۔ آگے جلد کسی جگہ ہم ان کا شمار کریں گے۔ اس وقت صرف مندرجہ ذیل پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علم اعداد و شمار، علم انشل، معاشیات، تاریخ روایات (اسے علم روایات بھی کہہ سکتے ہیں) تاریخ مذاہب یا علم المذہب۔ ان سب علوم کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب استقرانی طریقہ تحقیق پر عمل کرتے ہیں یا استقرانی طریقہ سے یہ مراد ہے کہ واقعات کی تصدیق سے کلیات قائم کئے جاتے ہیں۔ اس کی تشریح حسب ذیل ہے۔

اس طریقہ تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت مشاہدہ کو حاصل ہے۔ محقق کا فرض ہے کہ وہ ان سب واقعات کو دیکھے جو اس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ چنانچہ معاشیات نے اپنی تحقیق میں مشاہدہ کے مختلف طریقوں سے نہایت مفید کام لیا ہے۔ اس کی ایک مثال ہیں اعداد و شمار میں ملتی ہے جس کی بدولت ہمارے مشاہدات صحت سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ طریقہ اختصاص ہے اس طریقہ کے استعمال میں فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ اس سے بالعموم یہ مراد ہے کہ کسی ایک مسئلہ کی نسبت سطحی معلومات حاصل کرنے کے بجائے اس کی خوب کھود کھود کر چھان بین کی جائے حقیقت کا کھوج لگانے کے لئے یہ طریقہ بہت بہتر ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن

بالا

اس طریقہ کی مدد سے کلیات قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس کی مدد سے ہم مواد بہم پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے نتائج میں جان زیادہ ہوتی ہے۔ اور اہمیت کم۔ لیکن اگر ہم طریقہ اعداد و شمار اور طریقہ اختصار دونوں کو ملا کر اپنی تحقیق کریں۔ تو دونوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اگر ہم ایسے واقعات کی نسبت تحقیق کرنی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں گزرے تو ایسی صورت میں ہم ان دونوں مذکورہ بالا طریقوں کے استفادہ سے محروم رہیں گے۔ ہم واقعات کی تصدیق خود اپنے تجربہ سے کر سکتے ہیں یا دوسروں کی تصدیق کو بطور شہادت پیش کر سکتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں ہو سکتی ہے۔ اگر ہم ایسے مظاہر اجتماعی کی تحقیق کرنی ہے جو مکان کے اعتبار سے ہمارے مشاہدے کی حدود سے پرے ہیں یا جو زمانہ کے اعتبار سے مختلف عہدوں میں وقوع پذیر ہوئے ہیں تو ایسی حالت میں ان کی جانچ پر تال براہ راست ناممکن ہے۔ ان دونوں صورتوں میں حقیقت کا کھوج لگانے کا بس ایک طریقہ یہ ہے کہ جس قدر دستاویزیں اور شہادتیں ہیں دستیاب ہو سکتی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اب ان دستاویزوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو انسانی شہادتیں ہیں جو ہمیں سیاحوں کے اقوال اور دیگر اشخاص کے بیانات کے ذریعہ سے ملتی ہیں اور دوسرے وہ غیر انسانی شہادتیں ہیں جن میں معاشرہ کے قدیم آثار کا شمار ہوتا ہے جو وہ مٹنے کے بعد صفحہ عالم پر چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے عمارتیں، مکانات، لباس، آلات و اسلحہ اور زورات وغیرہ، بعض اوقات یہ مادی شہادتیں اشخاص کے بیانات کے مقابلہ میں زیادہ کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مادی اشیاء غلط بیانی نہیں کر سکتیں۔ ان کا مقصد یہ بھی نہیں رہا ہوگا کہ وہ ہمارے نتائج کے واسطے بھی شہادت کا کام دیں۔ غرض کہ ان دونوں اقسام کی

شہادتوں کو بڑی احتیاط سے قبول کرنا چاہیئے اور نہایت سختی سے انھیں تنقید کی جائے۔ کوئی پرکشا جاسیئے تحقیق کی دشواریاں نہیں نہیں ختم ہو جاتیں۔ ان مختلف شہادوں سے نتائج اخذ کرتے وقت اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان انسانی اور غیر انسانی شہادتوں کے نتائج مستنبط کرنے کو مجموعی طور پر ہم بالواسطہ مشاہدہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بالواسطہ اور بلاواسطہ مشاہدہ کے علاوہ تجربہ کے اصول کو بھی اس باب میں بہت اہمیت حاصل ہے لفظ تجربہ کو یہاں استعمال کرتے ہوئے ہمیں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس سے خلط بحث نہ پیدا ہو جائے۔ ہم آگے چلکر تفصیل سے بتلائیں گے کہ فنون عمرانی کا جہاں تک تعلق ہے تجربہ کا اصول نہایت کارآمد ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن علوم عمرانی میں اس اصول کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی یہ تجربہ سے مراد یہ ہے کہ آپ بذات خود کسی خیال کو وجود میں لاتے ہیں اور بعد میں حقائق سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حیات اجتماعی میں اس طریقہ کا چلنا مشکل ہے نظم اجتماعی اس قدر اہم اور نازک چیز ہے کہ ہم صرف اس غرض سے اس پر کوئی تجربہ نہیں کر سکتے کہ بعد میں اس کے نتائج کا مشاہدہ کر سکیں۔ ایسا آزمائشی ناممکن ہی بات ہوگی۔ اسمیں چنداں نقصان نہیں کہ آپ حیات اجتماعی کو سدھارنے اور بہتر بنانے کی نیت سے اس میں تبدیلی کریں لیکن محض اپنے ذوق تفتیش کی خاطر ایسا کرنا پرلے درجے کی ناعاقبت اندیشی ہوگی۔ چنانچہ ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کرنا چاہیئے کہ تجربہ کا اصول عمرانی فنون کی حد تک نہایت کارآمد ہے مگر عمرانی علوم کی بعضی اس سے نہیں سلجھ سکتی۔

لے اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے تو وہ عبت ہوگا اس واسطے کہ ضروری نہیں کہ عالم علمیات کو رائے عامہ کی قوتوں پر تصرف حاصل ہو۔ اور ظاہر ہے کہ رائے عامہ کے بغیر کمال عمرانی تجربہ عمل میں آہی نہیں سکتا۔

باب

اب جب کہ آپ نے اپنے مشاہدہ سے مختلف واقعات کو ایک جگہ جمع کر لیا تو دوسرا کام آپ کو یہ کرنا ہے کہ ان واقعات میں ترتیب پیدا کریں۔ اس کے لئے اور دوسرے طریقوں کی مدد درکار ہوگی۔ یعنی اصول تقسیم تحقیق علی عمل استقرار یا وضع کلیات۔

اصول تقسیم کے متعلق ہم یہاں زیادہ تشریح نہیں کریں گے اس لئے کہ عمرانی معاملات میں ان کی نوعیت بعینہ وہی رہتی ہے جو اور دوسرے مسائل کی تحقیق میں۔ تقسیم کا کام یہ ہے کہ ان اشخاص یا واقعات کو مرتب کرنا جن میں متقابلہ اختلافات ہم آہنگی کے عناصر زیادہ موجود ہوں یہ بھی ضروری ہے کہ ان اشخاص یا واقعات میں باہمی مشابہت متقابلہ زیادہ پائی جاتی ہو۔ تقسیم کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ خصائص دریافت کریں۔ اشخاص یا واقعات کا شمار زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ خاص طور پر قدیم اساسی خصائص کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس لئے کہ وہ دوسروں پر حاوی ہوتے ہیں اور ان کی علت ہوتے ہیں۔

اب ہماری بحث کا سلسلہ علت و معلول کے مسئلہ تک پہنچ گیا۔ علوم عمرانی میں اس مسئلہ کی وہ حیثیت نہیں ہے جو علوم طبیعی میں ہے۔ علوم عمرانی میں اس کی نوعیت کم و بیش وہی ہے جو علوم اجسام نامیہ (Organic) میں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ طبیعیات میں ایک منظر دوسرے مظہر کی علت اس وقت قرار دیا جاتا ہے جب کہ وہ بالائے شرام اس سے قبل نمودار ہوا ہو اور بعد میں دوسرے مظہر کو پیدا کرے۔ مثلاً بانی کے ابلنے کی علت وہ حرارت ہوتی ہے جو اسے پہنچائی جاتی ہے۔ مگر عالم ذی روح میں ایسا ہونا لازمی نہیں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ علت و معلول پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مظہر سے کوئی دوسرا مظہر وجود میں آئے اور پھر بعد میں وہ دوسرا مظہر جو معلول کی حیثیت رکھتا تھا علت بن جائے۔ اس کی بہترین مثالیں ہمیں اعضا

اور ان کے وظائف کے باہمی تعلق سے ملیں گی جسم انسانی کے کسی چٹھے بائیں کو لیجئے۔ اس کی بناوٹ سے اس کے وظائف کی نوعیت معلوم ہوگی اور اس کے وظائف سے اس کی بناوٹ کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اگر اس چٹھے کی بناوٹ میں کوئی عیب ہے تو اس کا اثر اس کی کارگزاری پر پڑے گا اور اسی طرح اگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے اس کی کارگزاری میں نقص پیدا ہوا ہے تو ضرور ہے کہ اس چٹھے کی بناوٹ میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی سیکڑوں مثالیں مختلف اعضا کے باہمی تعلق اور ان کے وظائف کے باہم دگر تعامل سے مل سکتی ہیں۔ دراصل عضو کی مثال ایک مرتب مشین کی سی ہے جس کا ہر جز دوسرے اجزاء پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ نظام اعصابی اور قوائے باطنی تعلق کا بھی یہی حال ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو چیز اعصاب کے واسطے مضر ہے لازم ہے کہ وہ باطنی میں فتور پیدا کرے اور بالکل اسی طرح جو چیز باطنی کے لئے نقصان رساں ہے وہ اعصاب کے لئے بھی مفید نہیں ہوگی۔ عالم عمرانی کا بھی بعینہ یہی حال ہے۔ بس اگر فرق ہے تو اتنا ہے کہ اس کی ساخت اور اس کے وظائف علم عضوی کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں، اور ان کا باہمی عمل و تعامل اچھاؤ سے خالی نہیں ہوتا۔ حیات اجتماعی کی خصوصیت ہے کہ اس میں سیاسی، اخلاقی اور ذہنی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہتی ہیں اور اعضا جن کا زندگی کے مختلف رخنوں سے تعلق ہوتا ہے ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ ریل پہلے پہل معاشی اغراض پورا کرنے کی غرض سے بنائی گئی اور اسے بعد میں ترقی ہوئی۔ لیکن اس غرض کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے اور بھی فائدے پہنچے۔ چنانچہ اس کی بدولت نئے خیالات کی نشر و اشاعت میں بڑی مدد ملی اور یورپ میں جمہوری طرز حکومت کا قیام ممکن ہوا۔ پھر ان مختلف مظاہر حیات کا اثر خود معاشی تنظیم کے

باب اول

ارتقاء پر مترتب ہوا۔ عمرانی (علم الحکمت) کی یہ ایک مثال ہے۔ اس سے آپ کو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مختلف مظاہر کے علی التواتر وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے علت معلول ہیں اور معلول علت میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ اس سلسلہ پر ہمیں چاہئے کہ عمرانی سکون یا قی نقطہ نظر سے بھی غور کریں۔ مثال کے طور پر ہم ایک خاص زمانہ اور ایک خاص مقام یعنی فرانس کے عہد حاضر کو پیش کرتے ہیں۔ یہاں ریلوں کا مکمل جال بچھا ہوا ہے، خیالات کی تحریک سرگرم کار ہے اور جمہوری حکومت کا دور دورہ ہے۔ ہم پورے نقیص کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حیات عمرانی کہ مذکورہ صد تینوں مظاہر ایک دوسرے کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس مثال سے آپ خود یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں کہ ایک ہی مقسام اور ایک ہی زمانہ میں علت و معلول کے باہمی تاثرات وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اس مثال سے آپ پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ عالم عمرانی اور عالم نامی میں علت کا مفہوم اس سے مختلف ہے جو عالم طبیعی میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض تحقیق نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ایک ہی اصطلاح کو اس قدر ایک دوسرے سے بعید مفہوموں کے لئے استعمال کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عمرانی تحقیق کے موقع پر لفظ علت کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی جگہ وظیفہ کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق جب کبھی دو مظاہر عمرانی کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنا ہو تو اس کی چند اہم ضرورت نہیں کہ ان کے علتی تعلق کی تشریح کی جائے بلکہ صرف یہی کافی ہو گا کہ ان کے وظایف کے فرق کو واضح کر دیا جائے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ مروجہ اصطلاحات کو اس طریقہ سے درجہ برہم کرنا ضروری نہیں ہمارے نزدیک عالم عمرانی میں عالم نامی کی طرح باہمی تعلق کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں جن کی تہ میں علت و معلول کی کارفرمائی موجود ہوتی ہے اول وہ تعلقات ہیں جو مختلف مظاہر عمرانی کے بیک وقت موجود ہونے سے

پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو مظاہر عمرانی کے یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہونے سے وجود میں آتے ہیں۔ پہلی صورت میں ممکن ہے کہ ان تعلقاً کی تہ میں آپ کو ایک خاص مظہر دوسرے پر غائب نظر آئے مگر بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ مظاہر جو ماتحت ہوتے ہیں اس مظہر پر اپنا اثر جمائیت میں جو غالب ہوتا ہے دوسری صورت میں اس مظہر کو جو پہلے ظہور پذیر ہوا بعد میں پیدا ہونے والے مظاہر کی علت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ موخر الذکر بھی اپنا انتقام لئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ اول الذکر پر اس قدر اثر ڈالتے ہیں کہ وہ خود اول الذکر کی علت بن جاتے ہیں۔ اس بحث سے آپ پر یہ بات روشن ہوگئی ہوگی کہ عالم عمرانی میں علت و معلول کی جستجو کس قدر دشوار اور نازک کام ہے۔ اس باب میں لازم ہے کہ ہم ان سب دعاوی سے اجتناب کریں جو تنگ نظری اور جانبداری پر مبنی ہوتے ہیں۔ سچا محقق وہ ہے جو کبھی اس امر پر فخر نہیں کرتا کہ اس نے فلاں مظہر کی علت دریافت کر لی۔ ہمیں یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ انسانی اعمال کے محرکات اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں اور ان کی نوعیتیں اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ کسی ایک اثر کو پیدا کرنے کے لئے متعدد اسباب کی کارفرمایاں ضروری ہوتی ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے کہ علت و معلول کی خصوصیات بعض اوقات آپس میں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں۔ اس تمام بحث سے ہم ایک علمی ضابطہ اخذ کر سکتے ہیں۔ جان اسٹورٹ ل نے اسباب و علل کی تحقیق کے سلسلہ میں چار اصول وضع کیے تھے جن سے سب لوگ واقف ہیں۔ وہ یہ ہیں :- اصول اشتراک، اصول اختلاف، اصول تسیر متالزم اور اصول باقی (Residue)۔ عمرانی مسائل کے حل میں شروع کیے دونوں اور جو تھے اصول سے زیادہ مدد نہیں ملتی اس لئے کہ ان کی تحلیل کر کے انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ اور بغیر اس کے اس کی کوئی صورت نظر

باب

نہیں آتی کہ ان کی باہمی مطابقت یا اختلاف کو پورے طور پر واضح کیا جائے
تیسرا اصول ہماری تحقیق کے لئے بہت کارآمد ہے۔ اس کے ذریعہ
سے ہم مختلف مظاہر عمرانی کے اختلاف و ظائف کا پتہ لگا سکتے ہیں
نیز اعداد و شمار میں استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آجکل فرانس میں دو
ایسے عمرانی مظاہر موجود ہیں جو بہ اعتبار زمان و مکان متوازی حیثیت
رکھتے ہیں۔ ہماری مراد ہے مظہر تخفیف آبادی اور مظہر اضافہ پس انداختہ
چنانچہ بعض علمائے عمرانیات کا خیال ہے کہ اول الذکر نے قطعی طور پر
موخر الذکر پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ ماہرین اعداد و شمار اجتماعی بھی اس
نتیجہ پر پہنچے ہیں یہ مل نے اپنی کتاب ”استقرائی و استخراجی منطق“ میں
ایک یہ اقوال کو یقیناً ایسا پیش کیا ہے جو عمرانی نقطہ نظر سے نہایت
اہم ہے۔

جب علت و معلول کا تعلق معلوم ہو جائے تو اس کی مدد سے کلیہ
قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس عمل کو استقراء سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر معاملہ
میں اس طریقہ تحقیق کو استعمال کرتے وقت کمال احتیاط درکار ہے۔ اور
خاص کر کلیہ اجتماعی معاملات میں تو اور بھی زیادہ بھونک بھونک کر قدم بھٹنے
کی ضرورت ہے۔ اس کے اسباب کی تفصیل ہم ابھی بتلائیں گے منطقی طور
پر اگر ایک مرتبہ علت و معلول کا تعلق پورے وثوق کے ساتھ قائم ہو جائے
تو اس کی صداقت کلیہ کے طور پر مسلم ہو جانی چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں
یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ ممکن ہے کسی معاملہ کی تحقیق کے وقت بعض اسباب
جس میں موثرانہ نظر آئیں اور کچھ عرصہ بعد کسی دوسرے مظہر کے پیدا کرنے میں

لے ملاحظہ ہوں جب نل کتب :- ارسین دونوں کی کتاب ”تخفیف آبادی اور تمدن؟“ بچے دی نکوست کی
کتاب ازدواجی زندگی میں کم اولاد پیدا کرنے کا رجحان اور اس کے اعداد و شمار کی تحقیق پر ڈاک بریٹون کی
کتاب ”فرانس میں تخفیف آبادی؟“ بال لے روالیو کی کتاب ”سلسلہ آبادی“ اور ریٹے ورم
کی کتاب ”توالد و توارث“

ان کا عمل دکھائی دے۔ چنانچہ پہلے معاملے کی تحقیق کے وقت میں جن منظر باہر
کے وجود کا گمان تک نہ تھا وہ ممکن ہے دوسرے منظر میں نمودار ہوں۔
اس طرح آپ نے دیکھا ماہروں کی سیاری دور بینی خاک میں مل گئی۔ اصل
میں حقیقت یہ نہیں ہے کہ جس اثر کی توقع تھی وہ ہمیں پیدا ہوا، وہ ظاہر تو
ہوا مگر اس طرح کہ اس کی صورت بدل گئی اور اس پر دوسرے تاثرات
کی ہمیں ہم گئیں۔ دراصل عالم عمرانی کی گونا گوں پیچیدگیوں اور تغیرات کے
باعث ایسی صورت حالات وجود میں آتی ہے۔ اسی واسطے ہم نے
ابھی کہا تھا کہ استقرائی کلیات عاید کرتے وقت انتہائی احتیاط درکار ہے۔
ان کلیات کو اگر وضع کیا جائے تو اس پر بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ سارا
عالم عمرانی پر حاوی رہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ عام
طور پر اجتماعی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان کلیات کو اس صورت
میں پیش کریں تو ہمیں تجربہ بنی آئندہ تکذیب سے مطلق خطرہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ
اس طرح ہم اپنے مستقبل کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

توانین اجتماعی کی تقسیم دو مقولوں میں ہو سکتی ہے۔ توانین توار اور
توانین تواتر۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ قانون، علت و معلول کے ان
تعلقات سے عبارت ہوتے ہیں جن میں تعمیم کی خصوصیت موجود ہو۔
انہیں تعلقات کے بطن سے ان کی تقسیم پیدا ہوتی ہیں۔ اس جسکے ہم
توانین توار کی نسبت سمجھ سکیں گے۔ آج اس زمانہ میں تاریخ عالم کی
جو خاص علمی تاویل کی گئی ہے اس کی روش سے نظام ہائے اجتماعی کو مجموعی
طور پر ایسے حصوں میں تقسیم کیا ہے جو اپنی امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں
مثلاً یونان اور قدیم روم کے شہر، ازمنہ وسطیٰ کے شہر، عہد جدید کی
مغربی مملکت، عربی قبیلہ، یا قدیم امریکی قبیلہ وغیرہ، مندرجہ بالا تقسیمیں
مشرقی کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہے۔ جو اسے دوسروں سے
متمیز کرتی ہے۔ ان مثالوں میں بعض مظاہر ایسے ہیں جو معاشی تنظیم
کے باعث وجود پذیر ہوئے، بعض خاندانی نظام کے رہن منت ہیں

اور بعض دوسرے ایسے ہیں جو اخلاقی، مذہبی، ذہنی یا سیاسی محرکات کی بنا پر ظہور میں آئے۔ دراصل یہ سب خصوصیات آپس میں ایسی بیوست ہوتی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ اگر آپ کسی ایک خصوصیت کو دریافت کر لیں تو سمجھنا چاہئے کہ دوسری خصوصیات بھی موجود ہوں گی۔ دراصل ان کی خصوصیت خود اسی بیوستگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قانون توار دے ہیں یہ تہہ جلتا ہے کہ یہ خصوصیات ساتھ ساتھ ایک منظر میں موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ عمرانیات کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ ان سب مثالوں کی الگ الگ تحقیق کرے۔ یہ کام دراصل ان مخصوص علوم عمرانی کا ہے جن کے طریقہ تحقیق کی نسبت ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ طریقہ تحقیق ایک قسم کا استقرائی عمل ہے۔ لیکن اصول استقراء کی تشریح کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری بحث ختم ہو گئی تحقیق کا ایک اور طریقہ ہے جسے طریقہ استخراج سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو بھی علوم اجتماعی میں بعض اوقات اچھی خاصی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ معاشیات نے جو علوم اجتماعی میں سب سے پہلے وجود میں آئی اور اس کی تکمیل ہوئی، اپنی تحقیق کی بنیاد پر اسی استخراجی طریقہ کو ٹھہرایا۔ رکاردو اور کارل مارکس کے ہاں اس طریقہ کے استعمال میں انتہائی غلو برتا گیا۔ اس کا رد عمل لازمی تھا اور اس کا اظہار اس صورت میں ہوا کہ کچھ دنوں بعد علمائے معاشیات نے طریقہ استخراجی کے خلاف طریقہ استقرائی کو ترجیح دینا شروع کر دیا۔ ان علمائے معاشیات میں وہ لوگ شامل تھے جو تاریخی اصول کے حامی تھے۔ طریقہ استخراجی کے خلاف انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طریقہ استقراء نے اپنا حلقہ عمل متعین کر لیا اور طریقہ استخراج نے عمرانی فنون کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ہم آگے جلتے بتلائینگے کہ یہ طریقہ تحقیق اس مخصوص گوشہ میں کیونکر کامیاب رہا۔ عام طور پر یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ علمی تحقیق کے لئے استقرائی طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دعویٰ

باب

ٹھیک نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علوم اجتماعی کی تحقیق میں طریقہ استقرائے کے ماتحت مشاہدہ، تقسیم، تلاش علت و معلول سب ہی آجاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی چاہے تو طریقہ استقرائے کو استعمال کر چکنے کے بعد اسی کی بنیاد پر طریقہ استخراج کی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔ جب ہم کسی عام اصول کو استقرائی تحقیق سے قائم کر لیں تو یقیناً ہمیں یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ استخراجی نتائج بھی اس سے اخذ کریں اور ان نتائج کو اپنی مزید تحقیق میں استعمال کریں۔ علاوہ بریں یہ عمل بھی قابل لحاظ ہے کہ خود استقرائی تحقیق میں بعض استخراجی عناصر نہیاں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیاس دراصل استدلال کا بہت ہی عام طریقہ ہے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر سادہ اصول موضوعہ کے منطقی نتائج کو تسلیم کرنے میں پس پیش نہیں ہوتا۔ ہم اس قسم کے استدلال رات دن استعمال کرتے ہیں اور غالباً شاید ہی کوئی ایسا فرد بشر ہو گا جو اس سے استفادہ نہ کرتا ہو۔ انسان کو قیاس سے محروم کرنے کے سوائے اس کے اور کوئی نسخہ نہیں ہو سکتے کہ آپ اس کی ذہنی قوت کو ضعیف و مجروح کر رہے ہیں نہاں ہیں علوم سے یہ توقع رکھنا چاہئے کہ وہ قیاس کو واقعات کی بنیاد واسطہ تصدیق کے بغیر نہ استعمال کریں۔ لیکن یہ کہنا کہ علوم کو بھی قیاس کے پاس تک نہیں پھٹلنا چاہیئے۔ ایک باطل لائسنسی سی بات ہے۔

ہماری مندرجہ صدر تشریحات دراصل مخصوص علوم اجتماعی کے طریقہ تحقیق سے متعلق تھیں۔ ہم یہ سمجھتے ابواب میں بتلا چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان مخصوص علوم کی جگہ عام عمرانیات سے علیحدہ تصور کرنی چاہئے۔ عمرانیات ان تمام مخصوص علوم کی مجموعی صورت کا نام ہے۔ وہ ان سب کے استخراج سے عبارت ہے۔ وہ ان علوم ہی سے اپنی ماعت کے عناصر جمع کرتی ہے اور پھر ان سے اپنی تفہیل کرتی ہے۔ چنانچہ ان وجوہ کی بنا پر ان علوم کے طریقہ ہائے تحقیق کی تشریح ضروری

باب

تھی اس لئے کہ ہم اسی صورت میں اس امر کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ عمرانیات
 اپنا سامانہ کیونکر فراہم کرتی ہے۔ ابھی ہمیں یہ بھی بتلانا باقی ہے کہ عمرانیات
 کس دھصب سے اپنی عمارت کھڑی کرتی ہے۔
 عمرانیات کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف علوم اجتماعی کے عام نتائج
 کو ایک دوسرے سے قریب کر دے۔ پھر ان نتائج کا باہم گرد آملہ
 کرے اور ایک کو دوسرے کی مدد سے مکمل کرے۔ اس کے بعد اس
 کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان سب نتائج میں امتزاج پیدا کیا جائے۔ عمرانیات
 کا کام یہ ہے کہ وہ حقیقت اجتماعی کے متضاد پہلوؤں میں ربط پیدا کرے۔
 ان میں ہر پہلو ایک مخصوص علم عمرانی سے تعلق رکھتا ہے۔ عمرانیات اپنے
 نتائج قائم کرنے کے لئے علم انفس سے استفادہ کرتی ہے اور اس کے
 علاوہ ان دونوں علوم سے بھی وہ اپنا مواد بہم پہنچاتی ہے جو اس سے قبل
 وجود میں آچکے ہیں یعنی علم الحیات اور علم کائنات۔ عمرانیات عالم اجتماعی
 کے کلیات و قوانین وضع کرتی ہے اور جب کبھی ممکن ہو تو عالم ذی روح
 اور عالم طبیعی دونوں کے قوانین کے ساتھ اپنے کلیات کو مطابق بناتی
 ہے۔ ہم آئے یہاں جن مسائل کی طرف ضمناً اشارہ کیا ہے وہ یقیناً مزید
 تفصیل کے محتاج ہیں۔ چنانچہ آئندہ باب میں ہم ان قوانین عمرانیات
 سے بحث کریں گے جو اس علم کے وجود میں آنے کے وقت سے آج
 تک وضع ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک ہمارے اسکان میں ہے انہیں پوری
 صحت کے ساتھ بیان کریں گے۔ اس وقت صرف آنا ذہن نشین کر لینا
 کافی ہے کہ عمرانیات کا اصلی طریقہ تحقیق امتزاجی اصول پر مبنی ہے۔
 اب ہم ذیل میں عمرانی فنون کے متعلق چند لفظوں میں اپنی رائے
 ظاہر کریں۔ ہمارے خیال میں ان فنون کا اصلی متنازعہ یہ ہے کہ وہ اجتماعی
 عمل میں تنظیم پیدا کریں اور اس کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔
 ان فنون میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ یہ
 نصب العین اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ پورا انسانی طبقہ اس کے تحت میں آجاتا

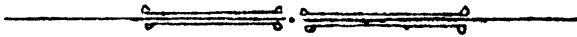
ہے۔ مثلاً معاشی فن کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آسودگی اور بائیل
مرہفہ الحالی کی زندگی بسر کریں۔ اخلاقی فن خیر و فرض کے احساس کو عام
کرنا چاہتا ہے۔ پھر فن کا دستور ہے کہ اپنے نصب العین کو حقیقت
سے دوچار کرتا ہے تاکہ اسکی روشنی میں اپنا اصول قائم کرے بعض مصنفین
اسے قیاس عملی سے تعبیر کرتے ہیں۔ نصب العین کو کبریٰ سمجھے اور
حقیقت کی دشواریاں صغرا کا کام دیتی ہیں۔ اب ان سے جو اصول اخذ
کیا جائے گا اسے ہم نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ فن کا یہ طریقہ دراصل اصول استخراج
کے تابع ہے غرضکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم کا رجحان خاص سے عام کی
طرف ہوتا ہے۔ اور فن کا رجحان عام سے خاص کی طرف۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قیاس (Syllogism) اپنے
نتائج کو حقائق کی کسوٹی پر نہیں پرکھتا۔ اگر عمل ان نتائج کو غلط ثابت کر دے
تو وہ بھی ان سے دستبردار ہو جائے گا یا پھر انہیں صحیح کرنے کی کوئی صورت
نکالے گا۔ اس کے طریقہ عمل کی آخری منزل تجربہ ہے۔ سیاسی فن کے
لئے تجربہ کے بہت سے فضائل بیان کئے گئے ہیں نیز معاشی و اخلاقی
فنوں بھی تجربہ کے مفید ہونے کے قائل ہیں۔ اس اجماع کی ذکر کے
بعد ہم عمرانی فنون کے متعلق کچھ نہیں کہیں گے اس لئے کہ
یہ موضوع ہماری کتاب کی حدود سے باہر ہے۔ ہم نے یہاں اجمالی

۱۔ Syllogism of action

۱۔ ملاحظہ ہو یون دون کی کتاب ”تجربہ سیاست“۔ اس کتاب میں مصنف
نے یہ بتلایا ہے کہ قانون ساز اگر اپنے مجوزہ قوانین کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہتا
ہے تو اسے چاہئے کہ تھوڑے دنوں کے لئے کسی محدود خط میں انہیں رائج کرے اور
مقامی عہدہ داروں پر اس کی تعمیل چھوڑ دے۔ کچھ عرصہ بعد اسے تجربہ سے ایسی
بصیرت حاصل ہو جائے گی کہ حسب ضرورت ان میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے ان کی تکمیل کر سکتا
ہے یا انہیں منسوخ قرار دے سکتا ہے۔

باب ۱۲ طویر پر اشارہ اس واسطے کر دیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ عمرانی فنون میں بمقابلہ علم، تجربہ و استخراج کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے یہ ہے ✓



لہ ہم نے اپنی کتاب ”فلسفہ علوم عمرانی“ کی دوسری جلد جس کا نام ”علوم عمرانی کے طریقہ ہائے تحقیق“ ہے، ان تلم مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔

پندرھواں باب

عمرانیات کے قوانین | ہم نے پچھلے باب میں عمرانیات کی یہ تعریف کی تھی کہ وہ سارے علوم اجتماعی کے امتزاج کا نام ہے چنانچہ عمرانیات پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ علوم اجتماعی کے اعلیٰ ترین قوانین کا سراغ لگائے۔ عمرانیات کی نسبت یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا وہ اپنے اس فرض کے پورا کرنے میں کامیاب ہوئی یا نہیں؟ لیکن ہماری رائے میں عمرانیات سے بہت زیادہ توقعات قائم کرنا بڑی غلطی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اس نے اپنی تحقیقات ابھی حالی میں شروع کی ہیں۔ دراصل اس قلیل عرصہ میں اس نے بہت کچھ امتداد زیادہ کام کر دکھایا ہے۔ آئے ہم اس بلکہ عمرانیات کی گزشتہ کارگزاری کا جائزہ لیں۔

اگر آپ ان بحثوں کو اپنے پیش نظر رکھیں جو پچھلے ابواب میں کی گئی ہیں تو ان کے مطابق آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی زندگی میں تین ایسے قوانین ہیں جو تین طور پر ایک دوسرے سے جدا نظر آتے ہیں۔ ہم ان تینوں قوانین کو تین خاص نقطہ ہائے نظر سے پیش کریں تو ان کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:-

ب

سکونیتی، حرکیاتی، اور کنسائی (Kinematic)

سکونیتی نقطہ نظر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوانین تو ارد قائم کرتا ہے۔ اس قانون کے توسط سے اجتماعی مثال (Type) کی خصوصیات اجاگر ہوتی ہیں۔ ہم اس کے متعلق تشریح کر چکے ہیں یہاں اس موقع پر ہم صرف ان اجتماعی مثالوں کا ذکر کریں گے۔ جو عام طور پر ہر جگہ مسلم سمجھی جاتی ہیں اور جنہیں تاریخ میں اہمیت رہی ہے۔ یورپ کی قدیم یونانی اور رومی تاریخ میں ان کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً (۱) خاندان (۲) شہر (۳) مملکت۔ پہلی اور دوسری مثال کے نمونے بکثرت ملتے ہیں مگر آخر الذکر کی مثال صرف ایک ملتی ہے۔ اس تاریخی دور کے بعد رومی مملکت میں شمالی وحشی قبائل کا عمل دخل بڑھنا شروع ہوا۔ ان قبائل کی اجتماعی زندگی کے اصول کچھ اور ہی تھے۔ چنانچہ رومی مملکت کے تباہ ہونے اور اس کی آبادی میں ان قبائل کے قتل بل جانے سے نئی نئی اجتماعی تشکیلیں وجود پذیر ہوئیں یہاں چوس اور چھٹی صدی عیسوی میں گاؤں (Villa) اور جاگیرداروں کے زرعی علاقے وجود میں آئے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں کمیون (Commune) اور پندرھویں صدی میں ہمارے عہد حاضر کی مملکت کی بنا پڑی۔ اس باب میں مزید تحقیقات نے ہمارے خیالات میں بہت وسعت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ یورپ کی تاریخ کے علاوہ علم الاقوام کی بصیرت افروز معلومات عمرانیات کے لئے بیکر مفید ثابت ہوئی ہیں۔ عربی اور بربری قبائل کے حالات کا خود ان میں ریکارڈ ہوا ہوا کیا گیا ہے، بنی اسرائیلی قبائل کے متعلق انجیل مقدس سے جو ہیں جبہ حشرہ حالات معلوم ہوئے تھے ان کی اب چشم دید واقعات سے جانچ پر تال کر لی گئی۔ چینی شہر آنامی گاؤں، اور منگولیا کے

لے جو دھواں باب

Ethnography لے

باب

قبائل کی نسبت آج ہمارے پاس معلومات کا نیا ذخیرہ موجود ہے۔ ان مختلف تحقیقات کی بدولت ہم اپنے زمانہ کی زندگی کا ان مختلف عمرانی اداروں سے صحت کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان میں قدیم امریکی، آسٹریلوی، وسط افریقی، اور بالخصوص ہائو قبائل قابل ذکر ہیں۔ ان قبائل کی اجتماعی مثالیں ہمارے عہد حاضر کی مثالوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اس ضمن میں دو مضمین خاص طور پر قابل ستائش ہیں جن کی کوشش وہی ہے اس قسم کی تحقیق کے اصول مترتب ہوئے۔ ہماری مراد فسل دے کو لانچ اور آئس ایچ مورگن سے ہے۔ اول الذکر نے یورپ کے ازمہ معتیق دوستی کی تحقیق کی ہے۔ اور آخر الذکر نے غیر یورپی قبائل کی اجتماعی زندگی کی نقاب کشائی کی ہے۔ ان معلومات کے نئے ذخیروں کے علاوہ علم الآثار اور علم اکیوان کی روز افزوں ترقی کی بدولت محققوں کی ایک جماعت اس کوشش میں سرگرم کار ہے کہ انسان کے قدیم ترین اشیاء (Types) کا کھوج لگائے۔ ہم اس کوشش کو قبل از وقت نہیں سمجھتے لیکن ہاں ہمارا خیال یہ ضرور ہے کہ اس کے نتائج برآمد ہونے کے لئے ابھی مدتیں چاہئیں۔

اب ہم حرکیاتی قوانین کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے وہ قوانین مراد ہیں جو حیات اجتماعی کی قوتوں کو کسی خاص پنج پر ڈالتے ہیں۔ آگست کوئٹ نے حرکیاتی قوانین کی دوسرے طور پر تاویل کی ہے۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان قوانین کو معاشروں کے قوانین جسم نامیہ

لے ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب ”قدیم فرانس کے سیاسی اداروں اور بلکہ معتیق کی تاریخ“

لے موصوف کی تحقیق کا سلسلہ فریڈک انجلس نے جاری رکھا۔ ملاحظہ ہو انجلس کی کتاب خاندان کی ابتدا اور ذاتی اور ریاستی ملک کا آغاز۔ ایچ راوے نے اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ مطبوعہ ۱۸۹۳ء۔

باب

سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ان قوانین میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم قانون یہ ہے کہ ”انسان کم سے کم حرکت یا سہی کرنا چاہتا ہے“ اسی کو دوسرے نقطوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ”انسانی کردہ کم سے کم کوشش یا کم سے کم صرف سے کسی خاص نتیجہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے“ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ”انسان اپنی سہی کے بدلے اعلیٰ ترین نتیجہ حاصل کرنا چاہتا ہے“ اس قانون میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ وہ محض عالم اجتماعی ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ عالم نامی اور عالم طبعی میں بھی اس طرح موثر نظر آتا ہے۔ اگر آپ اس قانون کے متعلق غور و فکر کریں تو آسانی آپ کو میکائیت کے اصل مدافعت اقل کی اس میں جھلک دکھائی دے گی۔ عالم عمرانی میں اس قانون پر نفسیاتی عنصر غالب آجاتا ہے۔ اس واسطے کہ اس کی تکمیل میں انسانی شعور و ارادہ کی کار فرمائی کو بھی دخل ہوتا ہے۔ امریکی ماہر عمرانیات نے کیا خوب کہا ہے کہ ہم اس قانون کو عمرانی زندگی میں ”قانون کفایت“ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ قانون نہ صرف معیشت کے اعمال پر بلکہ اس کے عمل و احساس کی ساری قوتوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے بعد بے جا نہ ہوگا اگر ہم گبریل تار د کے ”قانون نقل“ پر بحث شروع کر دیں ہم اس سے پیشتر اس قانون کی نسبت ذکر کر چکے ہیں کہ اس سے وہ انسانی عمل مراد ہے جس کے ذریعہ معاشرے میں اتحاد کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس اتحاد کی صورت یہ ہوتی ہے کہ افراد آپس میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ اس قانون کی دو جداگانہ نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ابتدائے نقل یک طرفہ ہوتی ہے یعنی ادنیٰ اعلیٰ کی نقل کرتا ہے اور پھر بعد میں دونوں ایک دوسرے کی نقل شروع کر دیتے ہیں یعنی اعلیٰ بھی ادنیٰ کی نقل پر آتا ہے۔ اس قانون کی دوسری نوعیت یہ ہے کہ شروع شروع میں یہ نقل باطنی حیثیت رکھتی ہے اور پھر ظاہری ہو جاتی ہے۔ یعنی پہلے پہل اپنے نہونے کی باطنی کیفیت کی نقل کی جاتی ہے اور پھر اس کی صورت کی بھی نقل شروع ہو جاتی ہے۔ ہم اس جگہ اس نظریہ پر زیادہ تفصیل سے بحث نہیں کر سکتے۔ صرف اس قدر متبلا نا ضروری ہے کہ تار د نے اپنے اس نظریہ سے بعض ایسے عمرانی حقائق کی طرف علمی دنیا

کی توجہ مبذول کرادی ہے جو اس سے قبل کسی اور مفکر کو نہیں سوچھے تھے۔ اس نے اپنی تحقیق میں بڑی صحت سے کام لیا ہے اور اس کے اجتہاد سے دوسرے محققین کی رہبری ہوئی۔

بلجیم کے عالم عمرانیات گیوم دے گریف نے جن کی نسبت پہلے بھی ذکر آچکا ہے، تاراد کے نظریہ کا خود اپنے نظریہ میں عجیب و غریب پیوند لگایا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ ہو تاراد کے خیالات کی تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ جھلک نظر آ جاتی ہے۔ گیوم دے گریف کے نظام خیال کا سنگ بنیاد "قانون تحدید" ہے۔ موصوف نے اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ ہر عمل کا حلقہ محدود ہوتا ہے، چاہے اس عمل کا تعلق کائنات فطرت سے ہو، یا عالم نامی سے یا عالم عمرانی سے۔ ہم اس خیال کو واضح کرنے کے لئے عالم عمرانی کی ایک مثال اس جگہ پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلم امر ہے کہ کسی صنعت کی پیداوار ہر جگہ نہیں پھیل سکتی، یا کسی ایک مذہب کے اصول و عقاید کی دنیا بھر میں اشاعت نہیں کی جاسکتی۔ قانون صرف ایک ملک کے لئے بنایا جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے چند ملکوں میں رائج کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑا فاتح اور کشور کشا ساری دنیا کو اپنے زیر اقتدار نہیں لاسکتا۔ چنانچہ مذکورہ بالا مثالوں سے قانون تحدید کی تشریح ہو گئی ہوگی۔ اس قانون کے عمل کی بدولت دنیا میں حریت اجتہاد اور تنوع کی رنگارنگی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل یہ قانون، قانون نقل کے ساتھ پاسنگ کا سا کام دیتا ہے اس واسطے کہ آخر الذکر کے اثر کی ہمہ گیری اس کی وجہ سے محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں ان دونوں قوانین میں عمرانی بشری کے متعلق صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

اس موقع پر ہم اپنی ایک رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں، وہ

باج

یہ کہ ان مختلف قوانین کی وجہ سے حکمرانی قوانین اور دوسرے عمرانی قوانین کا درمیانی فصل بری حد تک پر ہو جاتا ہے۔ قانون تحدید سے اجتماعی قوانین کو روک تھام ہوتی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ان قوانین میں باہمی توازن قائم کرے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قانون میں سکونانی عنصر بھی موجود ہے۔ اس کے برعکس قوانین نقل کا تعلق حیات اجتماعی کی اس قوت سے ہے جو تغیر و تبدل پیدا کرتی ہے۔ ان قوانین کے مفہوم میں توازن و ارتقاء کا تصور پوشیدہ رہتا ہے۔ اور ان میں تغیر و حرکت کی خاصیت بدرجہ اتم موجود رہتی ہے۔

اب صرف کئی قوانین کی تشریح باقی رہ گئی۔ دراصل ان میں اور قوانین ارتقاء میں کوئی فرق نہیں۔ ان کی دو تفصیلات خود بخود ہو گئی ہیں ایک کا تعلق ساخت کے ارتقاء سے ہے اور دوسری کا تعلق وظائف کے ارتقاء سے۔

در اصل آگست کونت کا "تین ذہنیوں" والا قانون اسی ارتقاء کے وظائف ہی کی دوسری شکل ہے۔ آگست کونت کا یہ قانون بہت شہور ہے اور سچ یہ ہے کہ علم عمرانیات کی بنا اسی پر قائم ہوئی۔ اس قانون کی رو سے انسانیت کو تین ذہنی حالتوں میں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ اول دنیائی ذہنیت کی حالت جس میں تو ہم پرستی، بت پرستی اور توحید کے دور شامل ہیں۔ دوسرے مابعد الطبیعی ذہنیت کی حالت جس میں انسان نے حقیقت کے متعلق تاویلیں پیش کیں اور تیسرے شہوانی ذہنیت کی حالت جو شخصیت و نعیم کے عہد سے عبارت ہے۔ ان ذہنیوں کی مناسبت سے ان عہدوں کی حکومت کی خصوصیات تھیں۔ چنانچہ دنیائی عہد میں جنگ آزما لوگ قوت و سطوت کے مالک ہوتے تھے۔ مابعد الطبیعی عہد میں یہ اقتدار فقہاء کے ہاتھ میں آگیا اور شہوانی عہد میں محققین کی جماعت سب میں زیادہ با اثر ہو گئی۔ ان عہدوں کی صنعتیں اور فنون بھی ان ذہنیوں کا آئینہ ہوتے تھے۔ بلاشبہ اس نظریہ کی بلندی

اور وسعت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ دعویٰ بھی یقیناً ناقابل تردید ہے کہ انسانیت کی رفتار کا رخ ثبوتی عہد کی جانب ہے۔ لیکن اصولی حیثیت سے ہمارا اعتراض وہی ہے جس کی نسبت ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم اجتماعی زندگی کے جین میں ذہنی عنصر کے غلبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ حیات اجتماعی میں ذہنی عنصر کا ارتقاء اس طرح عمل میں نہیں آیا جس طرح کہ آگست کونت نے اسے پیش کیا ہے۔ آگست کونت کے زمانہ سے لیکر ہمارے زمانہ تک علم ترقی کے بہت سے مدارج طے کر چکا ہے۔ جس میں اپنی تحقیق میں بعض ایسے عناصر کا جائزہ لینا ضروری ہے جن سے کونت مطلق بے خبر تھا۔ زمانہ قبل از تاریخ اور تاریخ کے ابتدائی عہد کی نسبت اس کے زمانہ میں معلومات کا کوئی ذخیرہ موجود نہ تھا۔ دراصل یہ تحقیق اس کے بعد شروع ہوئی۔ کونت کا خیال تھا کہ دنیائی عہد میں تخیل، مابعد الطبعی عہد میں استدلال اور ثبوتی عہد میں تجربہ کے ہاتھ میں زندگی کی باگ رہی لیکن جدید تحقیقات سے جن کی نسبت ہم نے ابھی اشارہ کیا، یہ ثابت ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کی تشکیل میں تخیل کو قدیم ترین موثر نہیں کہہ سکتے۔ تخیل کی ذہنی صلاحیت سے بہت قبل انسان پر ایسا زما بھی گزر چکا ہے۔ جب کہ حیوانی ادراک کے ماسوا اس کا سارا ذہنی سرمایہ مضطرب حافظہ کے چند مرتب تصورات تھے۔ اس عہد میں انسان کی حالت، بقول ایس آر سٹینٹن پروفیسر علم الاقوام، جامعہ امپریٹل ان مادہ پرستوں کی سی تھی جن کی مثال اب کہیں نہیں مل سکتی۔ انسانی ذہن کی ابتدائی حالت کے مقابلہ میں اس کے تخیل کی نشوونما دراصل اس کی ذہنی ترقی کی ایک بڑی منزل تھی جہاں پر دنیات کا وجود اس حقیقت پر دل ہے کہ انسان کی عقل کا معیار اچھا خاصا بلند ہو چکا تھا۔ اب اگر ہم آگست کونت کے تین ذہنیوں والے نظریہ کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ضرور اسے کہ اس میں تھوڑی بہت اصلاح کی جائے۔ اس نے مابعد الطبعی دور کو درمیانی

باب ۱۵

دور بتلایا ہے۔ ہم اسے دوسرے دونوں دوروں میں ضم کر سکتے ہیں اس طرح انسانیت کے ابتدائی دور کو جو دراصل اس کے اور سب دوروں سے زیادہ طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے، زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ اس تقسیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم انسان کی ارتقائی حالتوں کو اس طرح سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ انسانیت کا ابتدائی دور وہ تھا جب کہ اس کے خیال کی بنیاد محسوسات پر تھی اس کے بعد تجرید کا دور آیا۔ مدتوں وہ تجرید کی چار دیواری میں بند رہا۔ اب پھر ہمارے زمانے میں اس نے محسوسات کی طرف توجہ کی ہے لیکن وہ اب تک تجرید کی قدیم ذہنی عادتوں کو محسوس نہیں کر سکا ہے۔ وہ تجرید سے برابر استفادہ کرتا ہے۔ انسانی ذہنی ادراک سے تخیل تک پہنچا اور پھر تخیل سے استدلال تک۔ اب اس کا ذہنی رجحان یہ ہے کہ وہ ان سب مختلف طریقوں سے مستفید ہو کر حقیقت کا کھوج لگا رہا ہے۔

۱۔ اگست کونٹ کے بعد علمائے عمرانیات میں ہربرٹ اسپنسر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس انگریزی حکیم نے بھی اجتہادی وظائف کے متعلق ایک قانون وضع کیا ہے۔ اس قانون کی روش سے انسانیت کی ترقی کی رفتار عسکریت سے صنعت پرستی کی جانب مائل ہے، انسان کی ابتدائی تاریخ میں ہمیں بعض ایسے گروہوں کا پتہ چلتا ہے جو اپنی مشقت سے محاش پیدا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ایسے گروہوں کا بھی سراغ ملتا ہے جو اول الذکر کو لوٹ کھسوٹ کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

۲۔ یہ واضح ہے کہ اگست کونٹ کی تقسیم کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ بعض اور مصنفوں نے دوسری تقسیم کی ہیں۔ لوئس ویبر نے اپنی کتاب ”ترقی کی ہم آہنگی“ میں بجائے تین عہدوں کے دو ذہنیوں کا قانون پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں عہد باری باری سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ موصوف کا یہ نظریہ فکری اور مادی دونوں قسم کی ترقی پر یکساں مادی ہے۔

باجل

اس کے بعد ایسے زمانہ کا ہیں علم ہے جب اجتماعی زندگی میں نظم و ترتیب پیدا ہوئی اور سب لوگ اپنی محنت سے گزراوقات کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ لوٹ مار کی جگہ سب لوگ حقیقی اعمال میں متنبہ ہو جاتے ہیں۔ ہر برٹ اسپنسر کے اس قانون میں بہت سی ایسی باتیں نکلیں گی جو ہمارے کام کی ہیں مگر بعض ایسے حالات ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں جن سے ایک حد تک اس نظریہ کی تکذیب ہوتی ہے۔ اس سے ہم اس امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ عسکریت اور صنعت پرستی ساتھ ساتھ پہلو پہلو نشوونما پا سکتے ہیں۔ اس بنا پر شاید ان مظاہر کے متعلق کلیات قائم کرنا ذرا قبل از وقت ہو گا۔ ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہئے کہ صرف ہر برٹ اسپنسر ہی نے اس قانون کی طرف توجہ نہیں دلائی ہے۔ اس سے پیشتر آگست کونت اس امر کی تصریح کر چکا ہے کہ اصولی حیثیت سے اجتماعی تفوق و اقتدار جنگ آزماؤں کے ہاتھ سے نکل کر مالکان صنعت کے ہاتھ میں جانا چاہئے۔ فی الحقیقت اس خیال کو سب سے پہلے پیش کرنے کا سہرا انری دے سین سیون کے سر پر ہونا چاہئے۔ وہ کونت سے بھی پہلے اس خیال کی طرف اشارہ کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ قانون میرٹھی من نے اس سے بہت کچھ ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا تھا جن کا تعلق خاص کر قانونی تحقیق سے تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انسانیت کے ارتقاء کا میلان حیثیت (Status) سے معاہدہ (Contract) کی جانب معلوم ہوتا ہے جبکہ پہلی حالت میں حکومت کا قیام اپنے رعب و اقتدار پر مبنی ہوتا ہے اور دوسری حالت میں حکومت تابع ہوتی ہے اپنے شہریوں کی بے بروک لوگ رضا مندی کے۔ پہلی حالت میں فوجی قوت کا سلطوت و اقتدار لازمی ہے اور دوسری حالت میں حکومت صنعت و حرفت کی پر امن تنظیم کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرٹھی من اور اس کے ہم وطن ہر برٹ اسپنسر کے خیالات میں تو ارد کا دھوکا ہوتا ہے۔ آخر میں ہم یہ بتلادینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ دراصل ان دونوں

باج

کے خیالات کا سرشتیہ مشہور فرانسیسی عالم معاشیات ای گو یو کا نظریہ ہے۔ اس نظریہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسانی تاریخ میں ایک ایسا زمانہ گزر چکا ہے جب لہر آدمی نے دوسرے آدمیوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنی تمارتوجہ کا کائنات فطرت کے پوشیدہ خزانوں کو دریافت کرنے کی طرف منغطف کر دی۔

ہر برٹ اسپنسر نے انسانی ارتقاء کے متعلق ایک اور دوسرا قانون پیش کیا ہے جسے وہ پہلے سے کسی طرح کم اہم نہیں سمجھتا۔ اس قانون کا تعلق وظائف کے ارتقاء سے نہیں ہے بلکہ ساخت کے ارتقاء سے ہے۔ اس قانون میں جماعتوں کی بنیاد کے متعلق تشریح کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ قانون اجتماعی زندگی کے اسرار تکشف کرنے میں ہماری بہت مدد کرنا ہے۔ اس قانون کے مطابق ارتقاء کا میلان انتشار پذیر یک جنیت سے مربوط غیر جنیت کی جانب ہوتا ہے۔ یہ قانون تمام کائنات فطرت میں جاری و ساری ہے۔ اس کی بدولت عالم طبیعی میں سحابیہ (Nebula) سیارہ کی شکل اختیار کرتا ہے، عالم حیات میں جنین خانہ کا ہیولی وظائف رکھنے والے اعضا میں تبدیل ہوتا ہے۔ اسی طرح عالم عمرانی میں ابتدائی انسانوں کے غولوں سے، جن کی حیات اجتماعی کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا اور جس میں سب آدمی ایک دوسرے سے مشابہ ہو کرتے تھے، ہماری موجود ملکیتیں پیدا ہوئیں۔ ان ملکیتوں میں جو افراد آباد ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی مخصوص صفات کا حامل ہے۔ لیکن بایں ہمہ دوسروں کے ساتھ گونا گوں تعلقات کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے ہمارے علم میں اب تک عمرانیات کا کوئی ایسا قانون نہیں جو اس قانون سے بڑھکر حیات اجتماعی کی گہرائیوں تک پہنچتا ہو اور جس کی مدد سے عمرانی حقائق کے سمجھنے میں آسانی ہوئی ہو۔ میں ابھی ضمناً یہ بتلاؤنگا کہ اس قانون کی بدولت ہم نے فلسفہ کے ایک نہایت دقیق مسئلہ کا اچھوتا حل دریافت کر لیا جو سقراط اور افلاطون کے زمانہ سے لیکر آج تک عقل انسانی کو حیرت میں

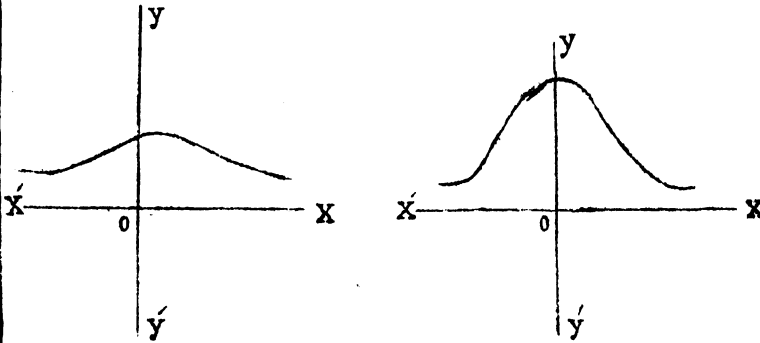
ڈالے ہوئے تھا۔ اس سلسلہ سے ہماری مراد وحدت و کثرت کی ہم آہنگی ہے۔ اس قانون سے ہم یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ موجودات عالم میں وحدت و کثرت کا جلوہ پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کا اختلاف محض ظاہری نوعیت رکھتا ہے۔ اس واسطے کہ فی الحقیقت وحدت اور کثرت دونوں دوش بدوش ارتقائی مدارج طے کرتے ہیں۔

اپنے سے قبل ایک غیر معروف مگر نہایت قابل مصنف نے جماعتوں کی ساخت کے متعلق ایک اور نظریہ پیش کیا تھا۔ اس مصنف کا نام ادولف کتے ہے۔ وہ اگست کونت کا ہم عصر تھا۔ اور وہ علم اعداد و شمار کے بانیوں میں ہوا ہے۔ اس نے اپنے ایک نہایت پر مغز مضمون میں جس کا عنوان ”انسانی صلاحیتوں کی نشوونما“ تھا یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ارتقاء کی وجہ سے انسانی گروہوں میں متحد ہونے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ان گروہوں کے ارکان کے درمیان جو اختلافات ہوتے ہیں، چاہے وہ جسمانی ہوں اور چاہے ان کا تعلق دولت و ثروت سے ہو، یا علم و اقتدار سے، مگر وہ سب کے سب مٹ جاتے ہیں۔ مخیلہ اور دوسری باتوں کے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیات اجتماعی کا مرکز مستحکم ہو جاتا ہے اور خلاف معمول افراد کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ جو جماعت اس قانون کے زیر اثر ہوگی اس میں ایسے افراد کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے گا جو حسب معمول معیار کے مطابق ہوں گے۔ کتے نے ترسیم کے ذریعہ اپنے اس نظریہ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس ترسیمی شکل میں مختلف جماعتوں کو ”گھٹنے کے خط منحنی“ سے مشابہ ٹھہراتا ہے اور ان افراد کو جو معمولی معیار

لے یہ مضمون بروکسز میں ”اجتماعی طبیعیات“ کے نام سے کتابی شکل میں ۱۸۳۵ء میں اور پھر ۱۸۶۵ء میں طبع ہو چکا ہے۔

باب

پر پورے اثر تے ہیں بیچ میں جگہ دیتا ہے اور جو اس معیار پر پورے نہیں
اثر تے انھیں سروں پر رکھا جاتا ہے۔



امتد اوزمانہ سے بیچ کا حصہ اٹھتا جاتا ہے اور سروں کے حصے
ایک دوسرے کی طرف جھکتے اور قریب ہو جاتے ہیں۔ تیا کس چاہتا ہے کہ
گنتے کے اس نظریہ کا اثر ضرور ہے کہ کورنو اور تار د کے خیالات پر بڑا
ہوگا۔

اب ہم اپنے ایک ہم عصر فرڈیننڈ تائیس کے نظریہ کے متعلق
کچھ اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف جرمنی میں کیل یونیورسٹی میں پروفیسر
ہیں اور عمرانیات پر تبحر رکھتے ہیں۔ موصوف کے خیالات کو اپنے ہم وطن
تحقیقین کے ہاں شرف قبولیت حاصل ہو چکا ہے۔ اس نظریہ میں "جماعت"
اور معاشرہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ تصور کیا گیا ہے۔ "جماعت" سے
وہ انسانی گروہ مراد ہے جس کا حلقہ اثر و عمل مقابلہ محدود ہوتا ہے، مثلاً

ملہ ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب "Gemeinschaft Gesellschaft" نیز ملاحظہ ہو

ہستون رشار کی تصنیف "علم عمرانیات"

Community

خاندان، کلیسا اور ریاست پر خلاف اس کے معاشرے سے وہ انسانی گروہ **باب** مراد ہے جس کا حلقہ بہت زیادہ وسیع ہو۔ اسے انسانوں کے خاندان عظیم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ ارتقاء کا میلان ”جماعت“ سے معاشرہ کے جانب رہا ہے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں میں ضم ہو جاتی ہیں اور پھر بتدریج معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ ہمارے مصنف انکی وسیع مشربی کو یقیناً سخت محسوس لگی ہوگی جب انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا ہوگا کہ خاص ان کے وطن نے اس انسانی معاشرہ کا اس صدی میں ظہور پذیر ہونا ناممکن کر دیا جس کے متعلق اس نے اشارہ کیا ہے۔

اب ہم ان نازک اور پیچیدہ مسائل کی نسبت خود اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ حیات اجتماعی کی ساخت میں بیک وقت دو ایسی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں مگر حقیقت ان میں باہم دگر بطنہائی موجود ہوتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ ایک تحریک کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی گروہ بندی زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور دوسری کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی گروہ بندیاں وجود میں آتی ہیں۔ اگر آپ یورپ کی عہد جدید کی تاریخ پر، شمالی وحشی اقوام کے حملوں سے لیکر آج تک، نظر ڈالیں تو سب سے پہلے آپ کو چھوٹی چھوٹی گروہ بندیاں دکھائی دیں گی پھر گروہ کا ایک سردار ہوتا تھا جس کے حدود اقتدار مقرر ہوتے تھے۔ بتدریج یہ حدود بڑھنا شروع ہوئیں۔ اس کے اسباب کی مختلف نوعیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی باہمی جنگ و جدال، کبھی شادی بیاہ اور کبھی وراثت کی بدولت ایک سردار مختلف جاگیروں کا مالک بن بیٹھتا تھا۔ چنانچہ کاؤٹی (County) اور ڈچی (Duchy) اسی طرح ابتداء وجود میں آئیں۔ پھر آہستہ آہستہ

لے جنگ عظیم کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم

باہل

بادشاہوں نے ان جاگیروں پر اپنا تسلط جمایا اور حقیقی ملکیت کی بنا پڑی۔ چنانچہ یورپ میں تقریباً ایک ہی زمانہ میں اس طرح سے کوئی ایک دہائی ریاستیں وجود میں آئیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اجتماعی تحریک بس یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی۔ سولہویں صدی عیسوی کے بعد سے تجارت نے ساری دنیا کی ٹٹا میں کھینچ دیں ہیں جسکی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ علمی اور فلسفیانہ خیالات کی رد و مختلف ملکوں کی سرحدوں کو اسی طرح سے عبور کر رہی ہے جیسے کبھی پرانے زمانہ میں مذہبی خیالات ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا کر لے تھے مختلف ملکوں کے قوانین میں دن بدن مشابہت بڑھتی جاتی ہے۔ اور قوموں کے رسوم میں یکسانیت آتی جاتی ہے۔ ادب اور فنون لطیفہ کی بدولت بقول ہوسیو گلیا مختلف لوگوں میں ہم وطنی کے سے تعلقات پیدا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان سب رجحانات کو دیکھ کر قیاس یہ کہتا ہے کہ اتحاد یورپ آہستہ آہستہ اپنا جنم لے رہا ہے۔ اسی کو آگت گوشت نے مغربی جمہوریت سے تعبیر کیا تھا جس قدر جلد اس تحریک کے اثرات امریکہ اور دوسرے براعظموں میں سرایت کریں گے اس قدر جلد یہ ممکن ہو گا کہ ساری انسانیت ایک رشتہ اتحاد میں منسلک ہو جائے۔ بلاشبہ انسانی ترقی کو رجعتوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بد قسمتی سے اس وقت تو یہ رجعت ایک ایسی حقیقت معلوم ہوتی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا! ازمنہ قدیم کی تاریخ بھی ان رجعتوں سے خالی نہیں ہے۔ روماء جب اپنی حیات اجتماعی کی تمام ارتقائی منزلیں طے کر چکا تو وحشی حملہ آوروں کے ہاتھوں وہ تباہ و برباد ہوا۔ غرض کہ ارتقائی تحریک بدستور جاری ہے اور کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ اس کی راہ میں جو رکاوٹیں آئیں گی انہیں دور کیا جائے گا اور ایک نہ ایک دن یہ تحریک ضرور اپنے نئے مقصد تک پہنچ جائے گی۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اس ارتقائی

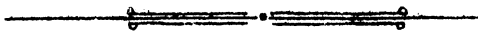
سلہ جنگ عظیم کی طرف اشارہ ہے (مترجم)۔

باب ۱۵

تحریک کے پہلو بہ پہلو اجتماعی زندگی میں ایک اور دوسری تحریک چمکے چمکے اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کا عمل دائرہ اول الذکر سے بالکل مختلف ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر بڑی قوم میں چھوٹے چھوٹے گروہ پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ گروہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں اور ان کے اصول عام طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں۔ پیشے، طبقے، اور خلقی رجحانات کی بنا پر ہزار ہا انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔ جوں جوں معاشرہ کے حدود وسیع ہو رہے ہیں اسی قدر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ سیکڑوں نئے گروہ پیدا ہونے جا رہے ہیں۔ اس تخلیقی عمل کو ترسیبی شکل سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اس شکل کو مختلف چھوٹی چھوٹی اشکال میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے دائرے ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوں گے اگرچہ ہوں گے سب ایک بڑے دائرے کے اندر۔ ایک دائرہ جاگیرداروں کے طبقے کی نمائندگی کرے گا یہ ایک اور بڑے دائرے کے اندر ہوگا۔ اسے ہم کاؤنٹی (County) کہہ سکتے ہیں۔ تیسری قسم کے دائرے تعداد میں کم ہوں گے۔ ان کا رقبہ مقابلہ زیادہ وسیع ہوگا۔ انھیں ملکیت سمجھئے جس طرح دوسرے دائرے میں آپ نے دیکھا تھا اسی طرح ہر دائرہ کے اندر بھی چھوٹے چھوٹے دائرے ہوں گے۔ اور تیسرے بڑے دائرے کے اندر ان کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی۔ یہ اجتماعی زندگی کی وہ تقسیمیں ہیں جن کی بابت ہم ذکر چکے ہیں۔ بہر حال حیات اجتماعی کی ساخت کے دو میلان ہیں۔ ایک نوادہ جو اتحاد و اختلاف پیدا کرتا ہے اور گردہوں کی تعداد میں تخفیف کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو اختلاف پیدا کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے گردہوں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ دراصل اگر غور سے دیکھئے تو ان دونوں میلانوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ اس واسطے کہ موخر الذکر میلان کی بدولت جو نئی اکائیاں وجود پذیر ہوتی ہیں وہ ان سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں جنھیں اول الذکر میلان فنا کرتا ہے۔ چنانچہ دوسرے الفاظ میں ہم اس حقیقت کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ وحدت و کثرت ایک ہی وقت میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

ج

ہم نے مندرجہ صدر اوراق میں ان قوانین کا ذکر مختصر طور پر کر دیا۔ جنہیں عمرانیات پیش کرتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سب قوانین مسلمہ طور پر صحیح اور مکمل ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ سب کسی نہ کسی عمرانی حقیقت پر مبنی ہیں اور حیات اجتماعی میں ان کی عام اہمیت قابل لحاظ ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ سب قوانین جیسا چاہئے باہدگر مربوط نہیں ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ لازمی طور پر ایک دوسرے کی ضد بھی نہیں کہے جاسکتے۔ ان قوانین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ عمرانیات بحیثیت علم ابھی مکمل نہیں ہوا اگر آہستہ آہستہ مکمل ہو رہا ہے۔



حصہ سوم

سولہواں باب

عمرانیات کا تعلق علم کائنات اور علم الحیات کیساتھ | پچھلے ابواب کی بحثوں سے یہ بات پوری ہے

طور پر واضح ہو گئی ہوگی کہ عمرانیات کا موضوع کیا ہے؟ اس باب میں ہم ان تعلق کی نوعیت بتلائیں گے جو عمرانیات اور اس سے قریب تر علوم کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ ہماری اس تحقیق سے عمرانیات کی تحقیق کا راستہ ٹھیک ٹھیک متعین ہو جائے گا۔

سب سے پہلے ہمیں جاننا چاہئے کہ عمرانیات اور ان علوم کے درمیان کیا رشتہ ہے جو اسکے وجود میں آنے سے قبل موجود تھے۔ ہمارے دماغ سخن علم کائنات اور علم الحیات کی جانب ہے۔

علم کائنات کا تصور غیر متعین ہے۔ ہمارے خیال میں اس اصطلاح کے تحت وہ سب نظریے آجاتے ہیں جو فطرت غیر نامی کے متعلق اب تک

باب پیش کئے گئے ہیں علم کائنات کی تحقیق کائنات فطرت کی ساخت اور اس کی حرکت کے متعلق اعلیٰ ترین خیالات سے بحث کرتی ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ علم میکائنت، فلکیات، طبیعیات اور کیمیا کے بنیادی اصول کی ترکیب سے بنا ہے۔

علم کائنات کی اس تعریف سے آپ غالباً یہ نتیجہ نکالیں گے کہ عمرانیات کو اس علم سے زیادہ سروکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ معاشروں کی ساخت مادے کی بناوٹ سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ بادی النظر میں عمرانیات کو اس علم سے کوئی تعلق نہیں مل سکتی۔ آج ہمارے زمانے میں بھی بعض محقق اس کھلی ہوئی حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ عمرانیات کو اپنی تحقیق میں علم کائنات سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔ چنانچہ بعض مصنفین نے یہ کوشش کی ہے کہ استخراجی اصول پر عمرانی میکائنت تیار کریں۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو علم و دانش میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں جیسے لیون وینا، جی سوئٹزر لینڈ میں، اسپریدیلون ہاریت رومانیہ میں اور اسے پور تو ندواہی بارسیلیو اسپین میں۔ لیکن ان لوگوں کی کوششوں کو زیادہ کامیابی اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے بس اتنا کیا ہے کہ ان مسائل کو جو عام زبان میں بیان کئے جاتے ہیں ان کو کھلے اور مغلق الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے طریقہ تحقیق سے ہمارے علم میں کمی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ عمرانیات اہم مسائل مساوات (Equation) کے ذریعہ سے حل ہونے والے ہیں۔ حیات اجتماعی کے پیچ در پیچ عناصر

لے لیون وینا کی حسب ذیل کتاب ملاحظہ ہوں :-

(۱) "معاشی توازن کے دو نظریے" (۲) "عمرانیات کے بعض جدید نظریوں کی تصحیح" (۳) "تاریخی مادیت اور عمرانی میکائنت" اسپریدیلون ہاریت کی مشہور تصنیف کا نام "عمرانی میکائنت" ہے۔ بارسیلو کی کتاب کا ہسپانوی زبان سے فرانسیسی میں ترجمہ ہو گیا ہے اور اس کا نام "عمرانی میکائنت کی بنیاد" ہے۔

۱۲۷ اور ان کے پیچھے تغیر و تبدل کے باعث اس قسم کی کوشش ہی کرنا بے سود ہے۔ ہمارے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ میکائیت کی تحقیق عمرانیات کے واسطے بیکار ہے۔ ہم نے اس کتاب کے دسویں باب میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ آگست کائنات کے نظریہ کو مکمل کیا جاسکتا ہے اور اس کی تصحیح کی جاسکتی ہے اور میکائیت کی تقسیم کو عمرانیات میں بھی رائج کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ عمرانیات ظلیات، طبیعیات اور کیمیا کے حقائق سے خوشہ چینی کر سکتی ہے۔ آگست کائنات کا یہ کہنا بالکل سچ تھا کہ اگر سالوں اور دنوں کی طوالت میں کسی قسم کا فرق آجائے تو حیات اجتماعی میں عظیم نشانِ تغیرات پیدا ہو جائیں۔ اسی طرح عمرانیات کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کیمیا اور طبیعیات کے قوانین کی بدولت ہماری زندگی کے حدود متعین ہوتے ہیں اور ان سے زندگی میں مدد ملتی ہے لیکن بس اس سے زیادہ آگے بڑھنا زیادتی ہوگی۔ اگر کسی عمرانی فن کی مدد سے کائنات فطرت کی قوتوں کو کام میں لایا جائے جیسے مختلف محالوں اور پیرویم کو صنعت میں استعمال کرنا، تو ایسی صورت ممکن ہے کہ اسے کہہ سکتے ہیں کہ ان مسائل کا تعلق خالص عمرانیات سے نہیں ہے۔

سائنس علمِ الحیات کا تعلق عمرانیات کے ساتھ بہت قریبی ہے۔ مظاہر عمرانی دراصل افراد کی زندگی کا خارجی رخ ہوتے ہیں اور مظاہرِ عضوی ان کی اندرونی زندگی سے عبارت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ماہرِ عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ علمِ الحیات کے مسائل پر وسیع نظر رکھتا ہو۔ مگر اس میں بھی غلو سے پرہیز کرنا چاہئے۔ عمرانیات جیسے علم کو یہ بات کبھی گوارا نہیں ہو سکتی کہ وہ علمِ الحیات کے ضمیمہ کی حیثیت اختیار کر لے۔ اس لئے کہ اول تو خود علمِ الحیات کا بنیادی تصور علمِ کائنات کی طرح نہایت

۱۲۸ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ Vilfredo Pareto نے بھی جو طریقہ ریاضی کو معاشیات میں استعمال کرنے میں بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، عمرانیات کے مسائل میں اس طریقہ کو استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب ”عام عمرانیات کے اصول“ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ پہلی جلد ۱۹۰۱ء میں اور دوسری جلد ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔

باب ۱۷

غیر متعین واقع ہوا ہے۔ اگر آپ علم الحیات کی تحقیقات کا غور سے مطالعہ کریں تو آپ ہمارے اس دعوے کی اصحت پر صا د کریں گے۔ ایف لے دنتے کی ”بیاض علم الحیات“ اور سالنہ علم الحیات کی جلدوں کے مطالعہ سے جن کی ترتیب اسی دیماج کرتے ہیں، ہم نے یہ رائے قائم کی ہے۔ ان علما کے نزدیک علم الحیات، علم الحيوان، علم نباتات، جراثیمیات اور علم طبقات سب رجاوی سے ملے۔ بلاشبہ یہ ایک دلچسپ علمی کوشش ہوگی اگر علم الحیات کے تصورات کو محدود کر دیا جائے مگر وقت یہ ہے کہ ان تصورات میں بیشتر ایسے ہیں جو اس کم حد بندی میں نہیں آسکتے مثال کے طور پر ہم مسئلہ تعلق جنسی کو پیش کر سکتے ہیں اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اس مسئلہ کو علم الحیات کے بنیادی تصورات میں سے سمجھنا چاہئے۔ ہمارا علم اب تک اس حقیقت کا کھوج لگانے سے قاصر رہا ہے کہ تعلق جنسی کن اثرات کے تحت تعین پذیر ہوتا ہے اور نہ ہم اب تک یہ جانتے ہیں کہ جانداروں کی تفریق جنسی کئے کیا اسباب ہیں اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ چونکہ خود علم الحیات کے تصورات غیر متعین ہیں اور یہ علم خود بالکل ابتدائی حالت میں ہے اس لئے اس کی تحقیق عمرانیات کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مارک اور ڈارون، اور ان کے دوسرے معصروں نے جو اصول علم الحیات کے پیش کئے تھے ان سے عمرانیات بھی اتنی ہی مستفید ہو سکتی ہے جتنا کہ علوم فطرتی۔ یہ دونوں حکیم قطابق، توارث اور انتخاب کو

لے سالنہ علم الحیات کی جثوں کے عنوان پر ہیں:۔ خلیہ، عمل پیدائش، جنین میں ارتقاء حیات، ربط اعضا و وظائف، تفریق جنس، موت، زندگی کے عناصر کمیادی اور اس کی ساخت، عام عضویات، توارث، ابتدائے نوع اور اس کی خصوصیات، جانداروں کی جغرافی تقسیم، نظام اعصابی اور وظائف ذہنی۔

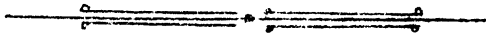
ملہ ملاحظہ ہو جو کیو کو لیری پروفیسر علم الحيوان جامعہ سارلون، کی کتاب ”تعلقات جنسی کے مسائل“ اور ہماری تصنیف ”فرائسی قوم میں بچوں کی پیدائش اور تعلق جنسی“

زندگی کے قدیم ترین اصول سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لئے اجتماعی عضویات (باربل) کے نظریہ کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ چاہے اس سے کسی کو اختلاف ہو مگر معاشرہ بمنزلہ عضو کے ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ مختلف عضویات کا مجموعہ ہے۔ اور وہ قوانین حیات جو آخر الذکر پر اپنا اثر رکھتے ہیں معاشرہ کے لئے بھی موثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ عالم عمرانیات کا یہ فرض ہے کہ وہ ان قوانین سے چشم پوشی نہ کرے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ علوم جسم نامیہ پر پورا تبحر رکھتا ہو۔

جس طرح عالم عمرانیات کے واسطے علم الحیات کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں، اسی طرح عالم حیاتیات کو بھی عمرانیات کی تحقیق سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں علوم کے ڈانڈے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ پیشتر اس کے کہ عمرانیات اور علم الحیات وجود میں آئیں معاشیات نے، جو اس زمانے میں علوم عمرانی کی رہبری کر رہی تھی۔ شہر بنیہ سسٹم کی تعلیم سے پورا استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ ہنری ملن ایڈورڈ نے اپنی کتاب ”بیاض عضویات“ میں انسانی اعضا کے وظائف کو واضح کرنے کی غرض سے ”محنت کی عضویاتی تقسیم“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح دراصل علم المعیشت کی اصطلاح ”مہل تقسیم کار“ کے بیچ پر وضع کی گئی تھی۔ خود چارل دارون اپنی کتاب اصل الانواع میں جس جگہ بحث حیات اور بقائے اصل کی نسبت بحث کرتا ہے وہاں صاف صاف کہتا ہے کہ اس کا نظام حیات دراصل ”ما تقس کے قانون کی تعلیم ہے جسے عالم نامی پر چسپاں کیا گیا ہے۔“ چنانچہ ہمارے ہمعصر ماہر علم تشریح نے خون کے کارکن خلیوں کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ یہ عجیب و غریب مظاہر حیات جسم کے لئے بمنزلہ پولیس کچھ ہیں۔ جسم انھیں اپنے اندرونی مفصود کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ اس سے آپ پر یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ کیونکر اصلی علوم ادنیٰ درجہ کے علوم سے

باب

استفادہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی رہبری بھی کرتے ہیں۔ بقول تارو یہ علوم آپس میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ نقل ایک طرف ہوتی ہے پھر باہر گر اثر و تاثر شروع ہو جاتا ہے۔



۱۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عمرانیات علم الحیات کے مقابل میں اعلیٰ رتبہ رکھتی ہے یا زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ عمرانیات کے موضوعوں کا تعلق علم الحیات کے مقابل میں ایسے وجودوں سے ہے جو زیادہ پیچیدہ ہیں اور اصل سب سے پہلے اس خیال کو آگست گوٹ نے پیش کیا تھا۔ ہم نے یہاں اس کے خیال کو تھوڑے بہت تغیر و تبدل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۲۔ ملاحظہ ہو ہماری کتاب 'ارتقاء' اجتماعی کے حیاتیاتی اصول

شہوان!

عمرانیات کا تعلق نفسیات کیساتھ آگست کونت نے علوم کی جو تقسیم ان کے رتبوں کے لحاظ سے کی ہے اس میں نفسیات کو کوئی جگہ نہیں دی۔ دینی انتخابیت نے اس کی طبیعت میں ایک ایسا رنگ پیدا کر دیا تھا کہ اسے نفسیات سے کوئی لگاؤ باقی نہ رہا۔ اپنے خیال کے مطابق اس نے نفسیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ علم الحیات میں ضم ہو جاتا ہے یعنی دماغی عضویات اور دوسرا حصہ عمرانیات کے تحت آ جاتا ہے۔

لیکن موجودہ زمانے کے محقق جو حقیقت کو ثبوتیت کے معیار پر جانچنے کے خواہر ہیں، نفسیات کو ایک علیحدہ خود مختار علم تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے اسے علم الحیات اور عمرانیات کے بین میں رکھا ہے۔ مسئلہ بھی زیر بحث ہے کہ نفسیات کا واقعی عمرانیات کیساتھ کیا تعلق ہے، مختلف قسم کے خیالات اس کی نسبت ظاہر کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اجتماعی نفسیات اور انفرادی نفسیات کی اصطلاحوں نے اور بھی خلط بھٹ پیدا کر دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان دونوں اصطلاحوں میں سے ایک کی بھی اطمینان بخش تعریف نہیں پیش کی گئی۔ بلاشبہ ان دونوں اصطلاحوں کا استعمال ناگزیر ہے بشرطیکہ مروجہ معنوں سے علیحدہ ان کے دوسرے معنی متعین کئے جائیں۔ چنانچہ ذیل کی سطروں میں ہم اس خیال کو واضح

باق

طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک نفسیات کی تحقیق کا تعلق تین ایسے مظاہر سے ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے اپنی وسعت اور اپنے معنی کی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔

بنی نوع انسان کی ایک مشترک نفسیات وہ ہوتی ہے جس میں ان قابلیتوں کی نسبتہ تصریح کی جائے جو دنیا کے تمام انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ فرانس کے مدارس وسطانیہ میں عام طور پر اسی نفسیات کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کو آجکل عام طور پر ”نفسیات انفرادی“ کہتے ہیں۔ اسے ”نفسیات اجتماعی“ سے مختلف بتلایا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اصطلاح ناقص ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی تحقیق انفرادی نوعیت نہیں رکھتی اسے فرد واحد کی ذہنیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ان خصوصیات سے بحث کرتی ہے جو تمام انسانوں میں یکساں طور پر مشترک پائی جاتی ہیں۔ یہ زیادہ موزوں ہوگا اگر ہم اسے ”نفسیات عام“ یا ”نفسیات انسانی“ سے تعبیر کریں۔

علاوہ میں بعض محقق یہ کہتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے کسی خاص عنصر کو علیحدہ کر کے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جیسے کسی خاص قوم، شہر، پیشے، طبقہ یا انجمن کے متعلق جداگانہ تحقیق کی جائے۔ یہ عناصر افراد پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان افراد میں بیک وقت ایسی خصوصیات ملتی ہیں جو بلا استثنیٰ بنی نوع کا مشترک سرمایہ ہیں اور اس کے ساتھ ایسی خصوصیات بھی ملتی ہیں جو محض اس گروہ کے افراد کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی خصوصیات سے نفسیات انسانی بحث کرتی ہے اور دوسری قسم کی خصوصیات کی تحقیق ”نفسیات اجتماعی“ کو کرنا چاہئے۔ یہ اصطلاح اب عام طور پر رائج ہو گئی ہے۔ جس ذاتی طور پر یہ اصطلاح پسند نہیں ہے لیکن چونکہ عام

لے ہم نے سب سے پہلے ۱۸۹۰ء میں ”علوم اخلاقی و سیاسی کی اکیڈمی“ کی روبرو اس کی نسبت اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کیا تھا۔ اس مضمون کا عنوان ”نفسیات عمرانی اور نفسیات انفرادی“ تھا۔

طور پر اسے مقبولیت حاصل ہو چکی ہے اور بعض دلچسپ تحقیقات اس نام سے موسوم ہو چکی ہیں اس لئے ہم بھی یہاں اس کو استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کی تحقیق کی بہترین مثال تین کی تاریخ ادب انگریزی میں ملتی ہے۔

ہر گز وہ کے فرد کی ذہنیت میں فرق ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کے علاوہ جو فرد اور تمام نئی نوع انسان میں مشترک ہیں آپ کو پہلو بہ پہلو ایسے خصائص بھی نظر آئیں گے۔ جو فرد کو کسی خاص گروہ کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور جو اس کی ذات کے لئے مختص ہوتے ہیں۔ ان خصائص سے ہماری مراد فرد کی ذاتی سیرت کے وہ خدوخال ہیں جو اس کے اور دوسروں کے درمیان بابہ الامتیاز ہوتے ہیں چنانچہ اشخاص کی سوانح حیات میں ان خصائص کو اجاگر کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر فرد کی خصوصیات علیحدہ علیحدہ دوسرے افراد میں بھی ملتی ہیں لیکن ان کی مجموعی کیفیت ہر فرد کی ذات سے مخصوص ہوتی ہے۔ وہ صرف اس کی شخصیت میں ملتی ہے اور اس کی ذات کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ اس کی بدولت اس کا وجود دوسرے افراد سے علیحدہ تصور کیا جاتا ہے۔ انہیں صفات کی تحقیق نفسیات انفرادی کا کام ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے خیال میں نفسیات کی تین تقسیم ہونی چاہئیں نفسیات انسانی یا عام نفسیات، نفسیات اجتماعی یا گروہوں کی نفسیات، اور نفسیات انفرادی یا مختلف شخصیتوں کی نفسیات۔ ہم نے اس تقسیم میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ جہاں ممکن ہو اس کی وسعت کم ہوتی جائے اور مفہوم کے لغت میں اضافہ ہوتا جائے۔ اگر ہم صرف عام نفسیات سے بحث کریں تو لازمی طور پر اسکے یہ معنی ہوں گے کہ کم انہی تحقیق کو مجرد کلیات سے آگے بڑھانا نہیں چاہتے۔ مختلف گروہوں کے خصائص کی تحقیق میں پھر بھی کچھ بات ہے۔ اس میں غموسات کے پیچیدہ مسائل سے مقابلہ

لے اس وقت ہمارے سلطانہ مدارس کی تعلیم میں عام طور پر صرف ان انسانی صلاحیتوں کو بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جو ہمارے ملک اور ہمارے زمانہ کے سب سے زیادہ مہذب لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام نفسیات کو نظر انداز کر کے آخر الذکر دو نو قسم کی نفسیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

باب ۱ زیادہ بحث ہوتی ہے۔ اس تحقیق کی آخری منزل یہ ہوگی کہ انفرادی اختلافات کا جائزہ لیا جائے۔

مسائل بالا کو پیش نظر رکھنے سے عمرانیات اور نفسیات کی تینوں نوعیتوں کا تعلق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ کبھی قراٹوں نہ کرنا چاہئے کہ عام نفسیات کا علم الحیات کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ دراصل نفسیات عام کا عمرانیات سے بہت دور کا رشتہ ہے۔ برخلاف اس کے نفسیات اجتماعی میں معاشرہ کا تصور ہر وقت موجود رہتا ہے۔ نفسیات اجتماعی کا ماتر مواد عمرانیات کے حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔ آپ کسی قوم کی ذہنیت اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ آپ اس کی آبادی، نسلی خصوصیات، معاشی اور خانگی زندگی، قانون اور سیاست وغیرہ کے متعلق علم نہ رکھتے ہوں۔ ان کے جانے بغیر کسی گروہ کی بناوٹ آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر آپ کسی قوم کی ذہنیت سے واقف ہوں تو اپنی حالت میں اس کے مختلف شعبہ ہائے حیات کو سمجھنے میں آپ کو سہولت ہوگی۔ اگر کوئی انفرادی ذہنیت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اجتماعی تنظیم سے واقفیت حاصل کرنا از بس ضروری ہے۔ اس واسطے کہ انفرادی ذہنیت مختلف عناصر عمرانی سے ترکیب پاتی ہے، ہم علوم کی منطقاً تنظیم کے اعتبار سے عام نفسیات کو عمرانیات اور علم الحیات کے مابین جگہ دے سکتے ہیں۔ نفسیات اجتماعی کو عمرانیات کے ہم رتبہ سمجھنا چاہئے۔ نفسیات انفرادی کا تجزیہ اس سے بڑے درجہ پر ہوگا۔ آئندہ کون سے کے نظریے سے بھی ہم گہرا بعد کی تحقیقات سے مکمل استفادہ کر لیں، انھیں سماج کی جانب رہبری ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی نوعیت متعین کرنے کے بعد ہم ان خیالات کا اچھی طرح سے جائزہ لے سکتے ہیں جو عمرانیات اور نفسیات کے تعلق کی نسبت پیش کئے گئے ہیں۔ تاہم یہ خیال تھا کہ عمرانیات دراصل نفسیات کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے نزدیک عمرانیات اس وقت وجود میں آئی جب نفسیات کے دائرہ تحقیق کو وسیع کر دیا گیا۔ اس کی حیثیت نفسیات کے ایک شاخہانہ سے زیادہ نہیں۔ درحکم کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عمرانیات میں یہ صلاحیت ودیعت ہے کہ وہ نفسیات سے علیحدہ ایک علم

باق

کی شان اختیار کر لے اور عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ ایسا کرے۔ عمرانیات "انفرادی نفسیات" سے علیحدہ چیز ہے۔ درجہ میں نے انفرادی نفسیات سے اس کے معمولی اور منطقی معنی دونوں مراد لئے ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ دراصل نفسیات عمرانیات کی مدد کی حاجت مند ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کی پیچیدگی اور اس کا الجھاؤ ان نظریوں کی پرفریب سادگی سے نہیں سلجھ سکتا۔ ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کرنا چاہئے کہ عمرانیات کو عام یا انسانی نفسیات کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ بغیر اس کے ہم کسی اجتماعی ادارہ کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہم اس جماعت کے انسانوں کی ذہنی ساخت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ عمرانیات نفسیات اجتماعی کی مدد کی بھی محتاج ہے۔ اس لئے کہ کسی خاص جماعت کی سیرت اس وقت تک ہمارے فہم و ادراک سے باہر رہے گی جب تک کہ ہم اس کے ارکان کے ذہنی میلانوں سے کماحقہ واقف نہ ہو لیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ عمرانیات کو نفسیات انفرادی سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی باک نہ ہونا چاہئے۔ عالم عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ اس فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی واقعہ کی نسبت کھوج دگا کر جس کی زبردست شخصیت نے معاشرہ اور انسانیت کے مقاصد پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ غرض کہ نفسیات کی تینوں اقسام عمرانیات کی تحقیق کے لئے جیسا کہ ہم ابھی تفصیل سے بتا چکے ہیں، نہایت مفید اور اہم ہیں۔

اس کے ساتھ ہمارا دعویٰ یہ بھی ہے کہ عمرانیات "نفسیات کی مذکورہ بالا تینوں قسموں کے لئے مفید خدمت انجام دے سکتی ہے۔ ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ انفرادی نفسیات کا علم اس وقت تک مکمل نہیں ہوا جب تک کہ وہ اجتماعی زندگی سے مواد نہ حاصل کرے۔ دراصل نفسیات اجتماعی اور عمرانیات کی ترتیب ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور وہ بے دریغ آپس میں ایک دوسرے سے استفادہ کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ عام نفسیات بھی عمرانیات کے نتائج کو استعمال کرتی ہے۔ یہ ایک امر مسلم ہے کہ انسانوں کی اعلیٰ مشترک ذہنی قابلیتیں اجتماعی زندگی کے توسط سے اگر پیدا نہیں ہوتیں تو اس کی بدولت تکمیل پذیر ضرور ہوتی ہیں۔ موسیو ازولے نے اس باب میں

کیا خوب کہا ہے کہ عقل شہر کی بی بی ہے، اس متوکلہ کو قبول عام نصیب ہوا اور اللہ کی وسواس نے اس کے ثبوت میں جو دلائل و براہین پیش کئے ہیں وہ بہت زیادہ تسکین بخش نہیں ہیں۔ درکیم نے بعد میں اسی خیال کو اپنے رنگ میں پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ فرد کی بعض صلاحیتیں صرف اجتماعی زندگی کی بدولت پھل پھول سکتی ہیں چنانچہ درکیم کہتا ہے کہ انسان نے پہلے پہل بتویب جماعتی زندگی سے سیکھی۔ قدیم انسان معاشرہ کے افراد کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے اس تصور کو سب ذی روح مخلوق پر عاید کیا گیا۔ پھر حیوانات، نباتات اور جمادات کی تقسیم ہوئیں۔ انواع کی تقسیم کا تصور اجتماعی زندگی کا رہین منت ہے۔ موسیو بیوی بروئل بھی ان خیالات کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ ابتدائی انسان اپنے قبائل اور ذی روح انواع کے باہر ایک قسم کا رشتہ قائم کر لیا کرتے تھے چنانچہ توٹیم (Totemism) کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ وحشی لوگ مختلف ذی روح ہستیوں کے درمیان جو امتیازی حد فاصل قائم کرتے ہیں وہ عموماً بہت دھندلی ہوتی ہے۔ ان کا خیال دراصل یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی سب ذی روح ہستیاں آپس میں ایک دوسرے کی زندگی میں شریک ہوتی ہیں۔ موسیو بیوی بروئل نے ان مشہداتوں کی بناء پر قانون شریکت وضع کیا ہے ان کا خیال ہے کہ ابتدائی انسان کی ذہنیت پر ان قانون کا بہت بڑا اثر تھا۔ آپ نے خود دیکھ لیا ہوگا کہ مذکورہ حیدر مصنفین کی کوششیں اس لئے دیکھی سے خالی نہیں۔ ابتدائی انسان کی ترقی کے متعلق ہیں جہاں کہیں سے لے موصوف کی کتاب ”جدید فطہر“۔

لے دیکھو درکیم کی کتاب میں مذہبی زندگی کی ابتدائی شکلیں ”اور اٹھ لیا آتھی تنہیں“۔ آخر اندر کے تیسرے باب میں ”توتیم کے نظام کائنات اور تصور نوع کے متعلق بحث کی ہے۔ نیز دیکھو درکیم اور موس کا مضمون بتویب و تقسیم کی بعض ابتدائی شکلیں“۔ جو سالنامہ عمرانیات کی چھٹی حدیس شایع ہوا ہے۔ دونوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سب سے پہلے تقسیم مکان کا تصور قبیلہ کی تقسیموں سے پیدا ہوا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے قبل موسیو ہنری برگون نے بھی تصور مکان اور وجود اجتماعی کے درمیان تعلق بتلایا ہے۔ ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب ”نفس بشری کے حقائق بدہی“

بھی مواد ملا اسے ہم نے یہاں پیش کر دیا۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کی ذہنی ترقی زیادہ تر باطنی اس کی اس جدوجہد کا نتیجہ ہے جو اسے حیات اجتماعی کے مسائل سے دوچار ہونے وقت کرنا پڑی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس جدوجہد کی بدولت انسان میں خاص قابلیتیں پیدا ہوئیں یا یہ کہ وہ پہلے سے اس میں ودیعت تھیں اور سعی و جہد کی بدولت وہ ابھر آئیں؟ یہ مسئلہ ہنوز محتاج تشریح ہے۔ ہمارے خیال میں درکیم کے نظریہ کو متسلل ہی سے قبولیت حاصل ہوگی۔ اس کے نظریہ پر یہ ایک اعتراض عاید ہوتا ہے کہ انسان کی بعض نفسی قابلیتیں ودیعتی ہوتی ہیں جنہیں وہ حیات اجتماعی سے نہیں حاصل کرتا۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ ان قابلیتوں کا تعلق حیات اجتماعی سے آنا نہیں جتنا کہ حیوانی ارتقاء سے ہے۔ یہ اعتراض علم الحیات کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں کیا جائے گا اور پہلا اعتراض نفسیات کے علمبرداروں کی جانب سے اٹھایا جائے گا۔ غرض کہ یہ بحث کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی نسبت طبعی فیصلہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ قبل از تاریخ کے انسان اور ابتدائی انسان کی نسبت ہدیٰ علمی تحقیقات مکمل نہ ہو جائیں۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ عمرانیات اور نفسیات دونوں ایک دوسرے کی ہر منزل پر مدد کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ان دونوں علوم کے درمیان خواہی نحو اہی مخالفت پیدا ہونا بے جا بات ہے۔ دراصل دونوں کا یہ فرض ہے کہ وہ باہم گرجن سلوک اور برادرانہ اتحاد سے پیش آئیں۔



لے ملاحظہ ہو یونیورسٹی کی کتاب "ہونی درجے کے معاشروں کے ذہنی اعمال" صفحہ ۴۔ اور ابتدائی انسان کی ذہنیت "صفحہ ۴"

اٹھارھواں باب

عمرانیات کا دوسرے علوم اجتماعی کیسا تھ | اس باب میں ہم اس کی توضیح کریں گے کہ عمرانیات کیا تعلق ہے؟
اس کتاب کے شروع میں کہا آئے ہیں کہ عمرانیات

درحقیقت علوم اجتماعی کے فلسفہ سے عبارت ہے۔ یہاں اس مسئلہ کو ہم نے پھر اس لئے چھیڑا ہے تاکہ ان مسائل کی نسبت ہم کلیات قائم کر سکیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان سے بھی ہیں بہت کچھ مدد ملے گی۔

نفیات کے مثل مخصوص علوم اجتماعی سے بھی عمرانیات بہت کچھ استفادہ کر سکتی ہے اور انھیں بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ عمرانیات ان سب علوم کے مجموعہ کا نام ہے۔ چنانچہ عمرانیات اپنے سارے عناصر انھیں علوم سے فراہم کرتی ہے۔ وہ اپنے وجود کے لئے انھیں کی رہیں منت ہے جو تعلق عمرانیات کا ان علوم کے ساتھ ہے اس سے زیادہ گہرا تعلق ہونا دشوار ہے۔

لیکن یہ تعلق دو طرفہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ عمرانیات ان علوم پر مبنی ہے گرا تھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ وہ ان سبھوں پر حاوی بھی ہے۔ وہ ان کی بنیاد بھی ہے اور ان کی عمارت کا بلند ترین حصہ بھی۔ عمرانیات کو مثل اس نقطہ کے سمجھئے۔ جہاں سے یہ سب علوم مختلف اطراف میں اپنا دور شروع کرتے ہیں اور پھر بالآخر اسی نقطہ پر سب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں ہم

(ابواب)

ان خدمات کی طرف اشارہ کریں گے جو عمرانیات نے ان علوم کی کی ہیں۔
 سب سے اول تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عمرانیات ان مختلف اجتماعی علوم کے
 لئے بنتر تہید کے ہے چنانچہ یہ عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ اس نصاب کو متعین کرے جس
 کے مطابق ان علوم میں سے ہر ایک کو اپنی تحقیق کے راستہ پر گامزن ہونا ہے نیز یہ تمام
 ک حیات اجتماعی کی چھان بین میں کس حد تک ان میں اشتراک عمل ممکن ہو سکتا ہے۔ اس
 کے لئے ضروری ہے کہ عمرانیات ان علوم کے مقاصد کی تحدید کرے اور ان طریقہ لئے
 تحقیق کی داغ بیل ڈالے۔ یہ کام حسب ذیل طریقہ پر انجام دیا جاسکتا ہے۔
 ایک حیثیت سے علوم اجتماعی کے مقاصد علوم اجسام نامیہ کے مقاصد سے بالکل متوازی
 ہوتے ہیں ہم اپنے مفہوم کی توضیح کے لئے اس تحقیق کو پیش کر سکتے ہیں جو جائز اردوں کے متعلق
 ہو رہی ہے۔ اس تحقیق کے دو طریقے ہیں مختلف انواع کی ساخت کی خصوصیات اور
 ان کے وظائف کی باری باری سے جانچ پڑتال کر کے یا مختلف انواع کی حیثیت
 مجموعی تحقیق کر کے ہم اپنے نتائج نکال سکتے ہیں پہلی صورت میں ہماری تحقیق کا نام علم موالید
 ہوگا۔ اس میں علم انجمن اور علم بحیات دونوں شامل ہیں۔ دوسری صورت میں ہم
 مطالعہ کا تعلق متعلق علم تشریح اور متعلق علم الاعضاء سے ہوگا تحقیق کے دونوں طریقے
 اپنی اپنی جگہ پر کارآمد ہیں۔ دونوں طریقوں کا مقصد حقیقت کا کھوج لگانا ہے۔ دونوں
 ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں یقیناً
 علم کی خدمت اسی میں ہے کہ تحقیق کے یہ دونوں طریقے دوسرے بدوش مروج ہیں۔
 مختلف معاشرہ کی بھی یہی نوعیت تصور کرنی چاہئے۔ پہلے آپ ان معاشرہ
 کے متعلق چھان بین کیجئے جن کے خصائص میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مخصوص
 گروہوں کے مختلف اجتماعی عناصر اور حقائق عمرانی پر نظر ڈالئے۔ پہلی قسم کی تحقیق اپنی
 نوعیت کے اعتبار سے علم موالید سے ملتی جلتی ہے۔ اسے ہم تاریخ انسانی سے تعبیر
 کر سکتے ہیں۔ اس میں اقوام اور مخصوص گروہوں کی تاریخ سے بحث کی جائے گی۔
 مختصر اصراف لفظ تاریخ ہم اس کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ ہماری دوسری تحقیق
 مختلف اجتماعی علوم کا مجموعہ ہوگی۔ باہمی مقابلہ سے یہ علوم اپنی حدود و مقرر کر لیتے
 ہیں اور یہ متعین کر لیتے ہیں کہ معاشرے کے کن کن عناصر اور کن کن حقائق عمرانی

کو اپنی بحث و نظر کے دائرہ میں رکھیں۔ ہم پچھلے اوراق میں ان علوم کی نسبت ذکر کر آئے ہیں یہاں ہم ان علوم کی فہرست دیتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ عمرانی ساخت سے بحث کریں وہ یہ ہیں :-

اجتماعی یا انسانی جغرافیہ :- اس کا موضوع کائنات فطرت اور انسانی معاشرہ کے باہمی تعلق کو متعین کرنا ہے۔

علم اعداد و شمار اجتماعی :- اس علم میں انسانی آبادی، اس کی تبویب اور ان مظاہر سے بحث کی جاتی ہے جن کا آبادی کے گھٹنے بڑھنے پر اثر پڑتا ہے،

علم النسل :- یہ علم مختلف نسلوں کے متعلق بحث کرتا ہے،

علم ساخت عمرانی :- اس علم میں مختلف انسانی گروہ بندیوں سے بحث کی جاتی ہے، جیسے توام، پیشے، طبقہ، اور انجمنیں۔

اس کے علاوہ وہ علوم ہیں جو مظاہر عمرانی کی تحقیق کرتے ہیں جیسے معاشیات، علم روایات (خاندانی مظاہر کی تحقیق اس کی شاخ ہے)، علم مذہب، تاریخ علوم، تاریخ ادب، تاریخ فنون، فقہ یا تاریخ قانون، علم سیاست۔

ہمارے نزدیک علوم اجتماعی کا نقشہ مذکورہ مددِ خدا و خالق کیسے مکمل ہو سکتا ہے، جو کہ عمرانیات کا شمار ان مذکورہ بالا علوم کی فہرست سے علیحدہ ہوتا ہے۔

اس واسطے وہ ان کی نسبت پوری غیر جانبداری کے ساتھ رائے دے سکتی ہے۔

وہ ان سب علوم کے مجموعے پر حاوی ہے۔ اگر ان علوم میں کوئی جھگڑا اٹھ کر اٹھو تو یہ عمرانیات کا منصب ہے کہ اسے طے کرے، ان کے حدود متعین کرے اور ان کے طریقہ کا

تحقیق کی توفیق کرے۔ یہ محض عمرانیات کی تلک و دو جزو کا نتیجہ ہے کہ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ اجتماعی علوم، فنون کے زمرے میں نہیں شامل کیے جاسکتے اور یہ کہ ان علوم کا مقصد انسانی

عمل نہیں ہے بلکہ محض علم حاصل کرنا۔ عمرانیات ان علوم کو طریقہ استدلال کی گمرہیوں سے محفوظ رکھتی ہے اور انھیں مجبور کرتی ہے کہ جھوٹے سے جھوٹے واقعہ کو مشاہدہ اور استفسار کی

کسوٹی پر لیں۔ اور انتہائی جزررسی اور احتیاط برتیں۔ اس مسئلہ کے متعلق ہم اس کتاب کے دسویں باب میں بھی ذکر کر چکے ہیں کہ عمرانیات ان علوم کے طریقہ تحقیق اور ان کے مقصد کو

متعین کرنے کے لیے خود انھیں کی تحقیق کے نتائج استعمال کرتی ہے۔ دراصل ان علوم میں سے کسی ایک میں بھی اپنی سکت نہیں ہے کہ وہ اپنے رعب و رکھ رکھاؤ کیسے اس فرض کو مکمل انجام دے سکیں اسکی وجہ سوائے اس کے کچھ

نہیں کہ عمرانیات کا حلقہ ان علوم کے حلقے سے زیادہ وسیع ہے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ اس کا حلقہ ان سبھوں کے حلقے پر حاوی ہے۔ عمرانیات ان علوم کو خود انھیں کے نتائج سے جانتی ہے اور ان طریقہ ہائے تحقیق پر تنقید کی نظر ڈالتی ہے جن کی بدولت انھوں نے یہ نتائج قائم کئے۔ جو طریقے اسے مناسب معلوم ہوتے ہیں انھیں وہ اپنی ترکیب میں جگہ دیتی ہے۔ یہ دراصل ایک انداز ہے جس کا مطلب دوسرے محققین کو دعوت عمل دینا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بھی اسی طرح کریں۔

اب ہم دوسرے نقطہ نظر کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عمرانیات سے صرف علوم اجتماعی کی سرحد ہی شروع نہیں ہوتی بلکہ ان کی منزل بھی اسی پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ ہم نے علوم کے طریقہ تحقیق کی بحث میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اگرچہ ہر علم اس کا دعویدار ہے کہ اپنی تحقیق شروع کرنے سے قبل وہ اپنا طریقہ تحقیق متعین کر لیتا ہے لیکن آپ اکثر دیکھیں گے کہ جب تحقیق پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے اس وقت طریقہ تحقیق متعین ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی مخصوص علوم اجتماعی کے موضوع کے متعلق غور و فکر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہم نے ابھی جو کہا وہ اصلیت پر مبنی ہے۔ جن کلیات پر یہ علوم مبنی ہوئے ہیں اور جن نتائج کو وہ مترتب کرتے ہیں ان سب پر عمرانیات حاوی ہوتی ہے۔ عمرانیات ان کلیات و نتائج کو ان علوم سے لے کر ان میں امتزاج پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک نہایت دشوار اور نازک کام ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ کام نہایت مفید ہے۔ کسی مفکر کے لئے شاید اس سے زیادہ آزمائش میں ڈالنے والا کام اور کوئی نہ ہو گا کہ اس سے فرمائش کی جائے کہ وہ انسانی ارتقاء کے اہم ترین پہلوؤں کو چند مختصر جملوں میں بیان کر دے۔ ہم پندرھویں باب میں دیکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی کوششیں کس حد تک کامیاب رہیں۔ وہاں ہم اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کوششوں میں سے کوئی ایک بھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئی لیکن یہ کہ اس کوشش کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا۔ جو چاہے اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ جس دن یہ کوشش کامیاب ہو گئی اس روز ہم از سر نو عمرانیات کی ان حد تک پرتصرہ کریں گے جو اس نے علوم اجتماعی کی ہیں۔ اس وقت یہ ممکن ہو گا کہ

باب

عمرانیات ان علوم کی تحقیقات کو مختصر ضابطوں کی شکل میں پیش کرے جنہیں ہر شخص
 آسانی ذہن نشین کر سکے گا۔ اس طریقہ پر عمرانیات کو یہ منصب حاصل ہو جائے گا
 کہ ان علوم کے حقائق کی تصدیق کرے۔ ظاہر ہے کہ کسی علم کے لئے اس سے
 بڑھکر باعث فخر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ اور کسی محقق کے لئے اس سے بڑھکر اور
 کیا حوصلہ ہو سکتا ہے کہ اس کی کد کاوش کی بدولت حقیقت کا ایک جز بے نقاب
 ہو جس سے ہر کس و نامکس کو فائدہ پہنچے۔

انیسواں باب

عمرانیات اور اجتماعی فنون کیسے ہم نے کہیں دوسری جگہ اجتماعی فنون کی یہ تعریف کی ہے کہ ان سے نظری ضوابط مراد لئے جاتے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کی حالت سدھاری جائے۔ یہ علوم کے دائرے سے خارج ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علم اور فن کا فرق ابھی تک لوگوں نے اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے بالعموم اخلاقیات اور علم سیاست کو فنی معلوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا واقعی اجتماعی فنون اور اجتماعی علوم میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اس جگہ ہم اس امر کی چھان بین کرتے ہیں کہ عمرانیات اور اجتماعی فنون کے درمیان جو تعلق پایا جاتا ہے۔ اس کی قیاسی طور پر کیا تعبیر کی جائے۔ ہمارے خیال میں عمرانیات اور اجتماعی فنون میں جو تعلق ہے اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ عمرانیات ان علوم سے بعض چیزیں مستعار لیتی ہے اور بعض چیزیں انھیں مستعار دیتی ہے۔

ہماری رائے میں وہ جو مستعار لیتی ہے اس کی اہمیت اس کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے جو وہ ان علوم کو مستعار دیتی ہے۔ عمرانیات فنون اجتماعی کی سب سے بڑی خدمت تو یہ کرتی ہے کہ وہ ان کے مقاصد اور ان کے طریقہ کار کے تحقیق کو متعین کر دیتی ہے۔ پھر وہ علم اور فن کے باہمی فرق کی بھی ساتھ ساتھ توضیح

(باب ۱۹)

کرتی ہے اور ان دونوں کے بنیادی تصورات کو ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیتی ہے۔
عمرانیات کی بدولت فنون اجتماعی کی تحدید عمل میں آتی ہے اور ہر فن کی حد بندی
کے ساتھ وہ یہ بھی واضح کر دیتی ہے کہ کونسا فن کس علم کے ساتھ مطابقت رکھتا
ہے۔ اصولی طور پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہر اجتماعی مقصد کے لئے ایک علم کا
ہونا ضروری ہے جو اس کی تحقیق کرے۔ اور ایک فن کا ہونا بھی ضروری ہے جس
سے علم کی تکمیل ہو۔ لیکن اس التزام کو مطلق نہ سمجھنا چاہئے۔ یقیناً ہر علم کے جدا گانہ
وظایف ہیں۔ چنانچہ معاشیات کی تکمیل فن معیشت سے ہوتی ہے۔ علم روایات
کے ساتھ اخلاقیات کا ہونا ناگزیر ہے۔ تاریخ ادب و آرٹ یا جمالیات کے ساتھ
حسن ذوق کے مختلف ضابطے وابستہ ہیں۔ علم مذہب اور اعتقاد کا چوٹی دامن کا ساتھ
ہے۔ تاریخ قانون کے دوش بدوش علمی قانون کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارا اشارہ
اس موقع پر متعین اور مضمتی کے فن کی طرف ہے۔ اسی طرح علم سیاست کے ساتھ
علمی سیاست کا ہونا لازمی ہے۔ گردہ علوم ہر فن میں اجتماعی ساخت سے بحث
ہوتی ہے ان میں علم اور فن کا درمیانی فصل ذرا زیادہ بڑا ہو جاتا ہے چنانچہ علم اعداد
شمار اجتماعی اور علم تولید الصلح (Eugenics) کے درمیان اور اجتماعی علم ساخت
اور تمدنیات (Civics) کے درمیان جو تعلق ہے اس سے اس پر روشنی پڑتی
ہے۔ اسی طرح اجتماعی جغرافیہ اور ان تمام فنون کے تعلق کی نوعیت سے جن
کا مقصد یہ ہے کہ کرہ ارض سے کیونکر زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔
ظاہر ہے علم و فن کے یہ تعلقات اتنے واضح نہیں ہیں جتنے ہونے چاہئیں۔
لیکن اگر آپ متعابقتی علوم اجتماعی کے بجائے بیانی علوم اجتماعی کو لیں، جو
در اصل تاریخ اقوام کا دوسرا نام ہے، تو اس صورت میں یہ عدم وضاحت
رفع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا فن کیسے تلاش کیا جائے

لے علم تولید الصلح سے وہ علم مراد ہے جو یہ بتائے کہ کس طریقہ سے قوم میں تندرست افراد کا اضافہ
کیا جاسکتا ہے۔ تمدنیات یہ بتاتی ہے کہ لوگ اچھے شہری کس طرح ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں نظائر بری
سے فرانسیسی میں لئے گئے ہیں۔ آفرادہ کراچی تک عام طور پر رائج نہیں ہوا ہے۔

جو دنیا کی تمام اقوام کی بہتری کا ضامن ہو۔ اس خصوص میں ہم اس طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اجتماعی فنون میں سے ہر ایک کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ قومی گرد و پیش کا لحاظ رکھے جس کی مناسبت سے اس کے اصول و ضوابط بھی حسب ضرورت قومی رنگ و رنگ بنائے جائیں۔ علم اور فن کے التزام کو اس سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنا بے سود ہے۔ یہ التزام چاہے کتنا ہی ناقص اور غیر مکمل بھی لیکن ہم اپنی تحقیق میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے عمرانیات نے اس التزام کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی توضیح کی۔

عمرانیات ہی نے سب سے پہلے فنون اجتماعی اور علوم اجتماعی کے مختلف طریقہ ہائے تحقیق میں امتیاز کیا۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں فنون کا طریقہ تحقیق نزولی ہوتا ہے اور علوم کا طریقہ تحقیق صعودی ہوتا ہے۔ ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں اور پھر اسے یہاں واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اول الذکر بہ متبادلہ آخر الذکر استخراج اور تجربہ کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔

یہاں یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اجتماعی فنون کے اہلوں کے لئے عمرانیات کی حیثیت تہیدی مطالعہ کی سی ہے کوئی آدمی کسی اجتماعی فن میں اس وقت تک کمال نہیں حاصل کر سکتا جب تک کہ اسے عمرانیات میں ورک نہ ہو بہتر تو یہ ہو گا کہ اسے دوسرے اجتماعی علوم سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہو مگر یہ لازمی نہیں۔ ہر شخص سے اتنی توقع رکھنا بے جا ہو گا۔ ہاں ماہر ماہرین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان علوم اجتماعی کے متعلق ایک مجموعی نقطہ نظر رکھتا ہو۔ اس کے لئے اسے عمرانیات کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسا علم نہیں جو تمام اجتماعی علوم کے امتزاج پر حاوی ہو۔ ہم اپنے اس خیال کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ ہمارے ہمعصوروں میں ایسے بہت سے موجود ہیں جو محال قانون سازیں، اپنی تصانیف میں یا اخبارات میں اپنے سیاسی نظریوں پر اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔ ان کا یہ فعل دراصل فن سیاست سے متعلق ہے۔ انھیں

(۱۹)

علم سیاست پر پورے عبور حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے ملک کے دستور اساسی تاریخ دستور اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں کے پبلک اداروں پر غور و خوض کر سکیں۔ اور بھی اچھا ہوا اگر وہ علم اعداد و شمار اجتماعی، معاشیات اخلاقیات اور قانون کے مسائل سے دلچسپی پیدا کریں۔ اسی سے ان کی ذات اور ان کے ملک دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر اس سے بڑھکر یہ ممکن ہو کہ ہماری قومی فتنوں کے فیصلہ کرنے والوں کے ذہن میں معاشرہ کی زندگی، ان کی ساخت، ان کے وظائف اور ان کے ارتقاء کی نسبت جھبک تصورات موجود ہوں تو کیا کہنا اگر عمرانیات کے حقائق سے وہ بصیرت مند رہیں تو یقین ہے کہ ان کے تمام فیصلے ہمیشہ عقل و دانش پر مبنی ہوں گے۔

اب ہم اجتماعی فنون میں صرف فن اخلاق کے متعلق کچھ عرض کر دیں۔ اسے اخلاقیات بھی کہتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اخلاقیات کا عمرانیات کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ایک مبسوط کتاب اس موضوع پر لکھی جا چکی ہے کہ عمرانیات کے وجود سے اخلاقیات کے سارے اصول درہم برہم ہو جائیں گے۔ غالباً قابل مضحکہ نے عمرانیات سے درکیم کے نظریے اور اخلاقیات سے سینٹ تھامس کے اصول مراد لئے ہیں۔ بلاشبہ ان دونوں مفکرین کے خیالات میں شکل ہی سے کوئی قدر مشترک ملے گی۔ لیکن دراصل یہ تنگ نظری ہے کہ آپ اخلاقیات کو مذہب تھامس تک محدود رکھیں اور عمرانیات کو کسی خاص نظریہ کے تابع قرار دیں۔

ہمارے خیال میں یہ بھی درست نہیں کہ درکیم کے خیالات رسمی اخلاق کے منافی ہیں اور اس دعوے کی تو یقیناً کوئی اصلیت نہیں کہ تمام علمائے عمرانیات رسمی اخلاق کی چیخ گئی کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ عمرانیات سے بڑھکر دنیا کا کوئی علم بھی رسمی اخلاق کا احترام نہیں کر سکتا۔ علمائے عمرانیات تو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق چند انسانوں کی من گھڑت چیز نہیں ہے۔ انسانوں میں غیر معمولی ذہانت والے بھی شامل ہیں اور دھوکے باز بھی۔ لیکن ان دونوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ کسی نظام اخلاق کی بنا ڈال سکیں۔ اخلاق دراصل انسانوں کی

سہ سمون دے پورا ج کی تصنیف "اخلاقیات اور عمرانیات کا تصادم" - ۱۹۱۸ء

اجتماعی زندگی کی اختراع ہے۔ اخلاق نتیجہ ہے ایک مسلسل جدوجہد کا جو ہر زمانہ (باب ۱۹) اور ہر ملک میں انسانوں نے کی۔ اخلاق معاشرہ کے منتخب افراد کے تجربہ کا حاصل ہوتا ہے۔ ان افراد کے تجربات و اصول عملی جامہ پہنکر عام ہو جاتے ہیں اور یہی اخلاق کی بنا ہے۔ ان کے یہ تجربات ماضی کا عطر اور مستقبل کے بہترین رہبر ہوتے ہیں۔ کیا ارباب علم میں کوئی ہے جو علمائے عمرانیات کی طرح رسمی اخلاق میں ان خوبیوں کو تسلیم کرتا ہو؟

ہمارے خیال میں اجتماعی فنون سے عمرانیات کو کوئی ایسے فائدے نہیں پہنچے جو قابل ذکر ہوں۔ بلاشبہ کسی خاص اجتماعی حالت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کے پیش نظر وہ سب اصلاحی نظریے اور ان کے نتائج موجود ہوں جو اس خاص گوشہ میں رونما ہو چکے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان معلومات کا حاصل کرنا علم کی بڑی خدمت ہے۔ عالم عمرانیات اس معلومات سے استفادہ کر سکتا ہے۔ لیکن بہترین صورت یہ ہے کہ عالم عمرانیات خود اجتماعی تحریک میں بذات خود شریک ہو اس طرح وہ مظاہر اجتماعی کی جو تائیدیں پیش کرے گا ان میں وثوق اور اعتماد کا عنصر متبادل زیادہ ہوگا۔ لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ عمل اور فن و علحدہ علحدہ چیزیں ہیں فن نظریہ ہوتا ہے اور عمل اس کی تکمیل ہے۔ ہر حال ہمارے خیال میں عالم عمرانیات کے لئے اس میں کوئی خاص فائدہ متصور نہیں کہ وہ عمل کے لئے نظریہ وضع کرے۔ یہ کام دراصل فن اجتماعی کے سیر کرنا چاہئے لیکن اسکے ساتھ یہ صورت بھی ممکن ہے کہ عالم عمرانیات عملی زندگی کے لئے بہ متبادل کسی شکل پرست کے زیادہ مناسب نظریے قیام کرے پھر حال اگر ایسا ہو تو کبھی یہ عمرانیات کا احسان ہوگا فن اجتماعی پر نہ کہ اسکے برعکس ہمارے خیال میں آگست کونت کے اصول عمرانیات کو اس کے تنظیمی منصوبوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس طرح ہر برٹ اسپنسر کے اصول عمرانیات کو ان معاشی تجاویز سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ جو اس نے انفرادیت کی تائید میں نہایت جارحانہ انداز میں پیش کی تھیں۔ غرض کہ جبکہ کہ نئی تحقیقات اس امر کو یائے ثبوت کو نہ پہنچا دیے کہ عمرانیات کو اجتماعی فنون سے مدد مل سکتی ہے اس وقت ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ اس قسم کے دعادی کو شبہ کی نظر سے دیکھیں

میسواں باب

عمرانیات اور فلسفہ کا تعلق - اب ہمیں بس یہ بتلانا اور باقی رہ گیا ہے کہ عمرانیات اور فلسفہ کے درمیان جو تعلق ہے۔ اس کی کیا نوعیت ہے۔

یہاں فلسفہ سے ہماری مراد عام فلسفہ ہے۔ جہاں تک کہ نفسیات اور اخلاقیات کا تعلق ہے تو اس کی نسبت ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اکثر اوقات ان دونوں کو فلسفہ کے اجزاء سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ہم نے ان کا عمرانیات کے ساتھ علحدہ مقابلہ کیا ہے۔

عام فلسفہ کے بھی کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ کم از کم یہ تو ہر کسی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ فلسفہ کے اہم مسائل کو پیش کرنے اور ان کے حل معلوم کرنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ انہیں سے ہر طریقہ اپنی اپنی جگہ کارآمد ہے اور محقق کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سب کی طرف مساوی توجہ کرے۔ ہم اس وقت جس مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہتے ہیں اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کا رنگ ہمارے طریقہ تحقیق پر بھی غائب آجائے گا۔

فلسفہ کی ایک یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ علوم کے امتزاج کا نام ہے۔ یہ تعریف ابھی جدید زمانہ میں پیش کی گئی ہے۔ چنانچہ آگست کونت نے اپنے فلسفہ ایجابی کو ہر برٹ اسپنسر نے اپنے ”فلسفہ امتزاجی“ کو اسی تعریف پر مبنی ٹھہرایا۔

تھا۔ ان دونوں مفکرین نے فلسفہ کا جو تصویر کش کیا ہے اس میں اور عمرانیات میں پہلا (باب) قریبی تعلق ہے۔ اور اس تعلق کی نوعیت بھی بہت ہی سادہ ہے۔ دراصل اس کے مطابق عمرانیات فلسفہ کی اعلیٰ ترین منزل کا نام ہے ہم فلسفہ کی عمارت کو تین منزلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ فلسفہ کائنات، فلسفہ حیات، اور فلسفہ عمرانی۔ آخر الذکر کی حیثیت ان تینوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہے۔ اس طرح فلسفہ تحقیق کی آخری کڑی عمرانیات ہوگی۔ بعض لحاظ سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ فلسفہ کا منشا ہی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ عمرانیات کے راستہ میں سے جس شخص و خاشاک کو صاف کرے اور اس کے وجود کو ممکن بنائے یہ سچ ہے کہ ہم نے ابھی جن مفکرین کا نام لیا ہے ان کے ہاں عمرانیات کے باب میں ایک طرح کا غلو پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آگست کونت کا تو یہ عقیدہ تھا کہ علم کی قدر و قیمت کا حقیقی معیار خود انسان ہے۔ بلاشبہ اس اصول کی سچائی میں کلام نہیں لیکن کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں حتی بجانب ہیں کہ علم کی ساری قدر و قیمت کا معیار وہ استعمال ہے جو اجتماعی زندگی میں مروج ہو۔ آگست کونت اس نتیجہ کا قائل تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر اس نے ان سب علوم کی تحقیق کو بے سود بتلایا ہے جن سے براہ راست انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ فلکیات اپنے دائرہ تحقیق کو محض مظاہر شمسی تک محدود رکھے اور سیاروں سے مطلق بحث نہ کرے ہمارے خیال میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو اس کے ان دلائل کو سمجھ سکے۔ کائنات فطرت کے دور افتادہ مظاہر کی تحقیق خالص علمی نقطہ نظر سے وہی حیثیت رکھتی ہے جو انسان سے قریب تر مظاہر کی تحقیق کو حاصل ہے۔ اس سے انسانی ذہن کو تسکین ملتی ہے اور اس کے اعلیٰ ترین مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کی بدولت انسانی جوہر پرورش پاتا ہے۔ ہمارے خیال میں کسی متفق کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ یہ تحقیق کبھی بھی انسان کے کام نہیں آئے گی۔ ہیں مستقبل کا حال

سلہ یہاں ہماری مراد علم کے مادی استعمال سے نہیں ہے۔ غالباً آگست کونت خود اس حد تک دعویٰ نہ کرتا۔

(ایضاً)

کیا معلوم ہے چنانچہ علم کو علم کی حیثیت سے فروغ دینا لازم ہے نہ اس لئے کہ معاشرہ کو اس سے فوری نفع کی امید ہو سکتی ہے۔ عمرانیات کے نقطہ نظر کو آپ ایک اور طریقے سے بھی اعلیٰ وارفع ثابت کر سکتے ہیں وہ طریقہ یہ ہے کہ آپ عمرانیات کے تصورات کو علوم جسمانیہ و علوم کائناتی میں رائج کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ اعلیٰ تصورات کی تاویل ادنیٰ تصورات سے نہیں کیجا سکتی اسی طرح ہمارے خیال میں یہ ایک بے جا کوشش ہوگی اگر کوئی عالم عمرانی کے حقائق کو طبیعی و کیمیائی قوانین کے یا حیاتیاتی کلیات کے تابع قرار دے۔ اس کے برعکس کسی کو حیاتیات حاصل نہیں کہ اعلیٰ تصورات کو ادنیٰ درجے کے تصورات میں تلاش کرے۔ چنانچہ عضوی و کائناتی مسائل کے حل کے لئے عمرانیات کی اصطلاحیں بے سود ہیں۔ اس سے غلط بحث کا اندیشہ ہے۔ نیز یہ کہ اس طریقہ سے مسائل پر جو روشنی ڈالی جائے گی وہ جھوٹی روشنی ہوگی۔ چنانچہ عمرانیات نہ خود حل دے اور نہ کسی دوسرے کے حل کو گوارا کرے۔ وہ بے جا حل اندازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اس سے اس کے وقار کو شخص لگنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن وہ فلسفیانہ تصورات کو اپنے آغوش میں جگہ دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہے۔

مذکورہ بالا خیال کے مقابلہ میں ایک دوسرا خیال پیش کیا گیا ہے۔ اس خیال کے حامی فلسفہ کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ فلسفہ دراصل علم کے وظائف سے عبارت ہوتا ہے۔ اس مسلک کے پیرو فلسفہ کو بجائے علوم کے پھیلی صف میں رکھنے کے آگے کی صف میں لگادیتے ہیں۔ ہم نے فلسفہ، علم اور وظائف کے الفاظ جو یہاں استعمال کئے

ہے ہم میں سے کوئی بھی تعین کیا تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں فلاں چیزیں آئندہ انسان کے لئے کارآمد ہونگی۔ خود آگست کونت نے اس ضمن میں ایک واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے جو قابل ذکر ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ یونانی ماہرین آتلیس نے جو Conic Sections (قطعات مخروطی) کے متعلق خیال آرائیاں کی تھیں ان سے سیاروں کے مدارات کے متعلق حقائق منکشف ہوئے۔ سیاروں کے مشاہدے سے جہاز رانی کو مدد ملی۔ چنانچہ وہ خیال آفرینان جو شروع شروع میں محض نظری حیثیت رکھتی تھیں بعد میں عملی زندگی میں کس قدر کارآمد ثابت ہوئیں۔

ہیں ان سے ان کے مراتب کو ظاہر کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ ہم نے یہاں انھیں منطقی ترتیب سے استعمال کیا ہے۔ مذکورہ بالا نقطہ نظر سے فلسفہ دراصل علم کی قیاسی حالتوں کی تنظیم کا نام ہے۔ فلسفہ کے اصول انسانی خیال کی ساخت اور اس کے نشوونما کے ضامن ہیں۔ یہ نظریہ کائنات نے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ وہ فلسفہ کی یہ تعبیر کرتا ہے کہ "فلسفہ علم کی عام تنقید کو کہتے ہیں۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نقطہ نظر سے فلسفہ کی نظر میں عمرانیات کی کیا حیثیت ہوگی؟ ہم یہاں ان سب دشواریوں کا ذکر فضول سمجھتے ہیں جو عمرانیات کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اور اس کی فلسفیانہ تہذیب میں مانع آتی ہیں۔ ہمارے لئے جس اس قدر جاننا کافی ہوگا کہ اور دوسرے علوم کے مثل عمرانیات کے حلقہ عمل کی بھی تصویر بدستوری ہے اور اُسے ان حدود کی پابندی لازم ہے جو اس پر عاید کی گئی ہیں۔ دوسرے علوم کی طرح عمرانیات کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے میں لوچ پیدا کرے تاکہ انسانی ذہن میں اس کی سمائی ہو سکے اور احساس و فکر کے توازن کا اس کے ساتھ ربط قائم ہو۔ خارجی مادہ (اور معاشرہ) کو اس کے ایک عنصر کی طرح سمجھنا چاہئے، جس وقت انسانی ذہن میں داخل ہوتا ہے تو اس کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ ہم صرف منظر کا ادراک کر سکتے ہیں۔ لیکن اس منظر کے پیچھے جو حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ ہمارے سرحد ادراک سے پرے ہوتی ہے۔ یہی حقیقت اس منظر کی بنائے وجود ہوتی ہے چنانچہ اور دوسرے علوم کے مثل عمرانیات بھی مظاہر سے بحث کرتی ہے۔

عمرانیات پر جو اس طرح تنقید کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں علمائے عمرانیات یہ کہتے ہیں کہ ہاں، ہماری تحقیق عام علم کی ترقی کے تابع ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ترقی علم کی عام شرائط کیونکر جوڑیں آتی ہیں؟ خود علم کے اندر انسانی ذہن کا عنصر موجود ہوتا ہے اور یہ ذہنی عنصر ہر خارجی شے پر اپنا نقش جمادیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کا تعلق ان ادبیات سے نہیں ہے جن کی تشریح محال ہے۔ یہ ذہنی عنصر صد ہا سال کی جدوجہد سے مجتمع ہوا ہے۔ اس میں حیاتیاتی اور جسمانی دونوں موثرات موجود ہیں۔ اسپنسر کا قول ہے کہ عقل کے اصول وضوابطہ

باب

اگرچہ آج ہمیں بالکل ہر فرد بشر کے لئے فطری معلوم ہوتے ہیں مگر فی الحقیقت وہ نتیجہ ہیں انسانی ذہن کی اس پیہم جدوجہد کا جو اسے انمازل ارتقاء کے طے کرتے وقت کرنا پڑی۔ چارے معاصر علمائے عمرانیات اسپنسر کی تائید کرتے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ موجودہ انسانوں کی ذہنی ساخت بیشتر ان کی اجتماعی زندگی سے ماخوذ ہے۔ عقل و فکر کی صلاحیتیں نتیجہ ہیں اس توجہ کا جو ابتدائی انسان نے اپنی تنظیم کے لئے کی۔ سچ یہ ہے کہ اس دعوے کا مکمل ثبوت اب تک نہیں پیش کیا گیا اور اگر فرض سمجھیں کہ ثبوت فراہم ہو جائے تب بھی انسانی ذہن کی ساخت کے متعلق ہم تشفی بخش توضیح نہیں کر سکیں گے۔ اس کا اعتراف ہے کہ اس فطریہ کے بعض نکات نہایت سبق آموز ہیں۔ اور ہماری تنہا یہ کہ اس سلسلہ پر تحقیق کے سلسلہ کو جاری رکھا جائے۔ اگر یہ تحقیق جیسا کہ چاہئے پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علم کی شرائط میں عنصر اجتماعی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد علم کی تحقیق محض قیاسی نہیں ہوگی بلکہ عمرانیات کی مدد اس کے لئے درکار ہوگی۔

علاوہ بریں عام فلسفہ کے ضمن میں ایک اور تصور ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ یہ تصور قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اس کے حامیوں میں حکماء کی بہت بڑی تعداد شامل ہے اور ان میں بعض بہت شہرت رکھتے ہیں یہ فلسفہ کا ابدی طبعی تصور ہے۔ اس تصور کی بدولت جو مختلف مذاہب فلسفہ وجود میں آئے ان میں باوجود ظاہری اختلاف کے یہ خیال مشترک ملے گا کہ ظاہری حقائق سے ماوراء جن پر شہد و زبان کی قیود عاید ہوتی ہیں، ایسے حقائق بھی ہیں جو ان قیود سے بالاتر ہیں۔ یہ حقائق ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس تصور سے جہیں اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ مادی قوتوں کے اثر کے علاوہ اخلاقی قوتیں بھی اپنا کوئی وجود رکھتی ہیں۔ علم ان کی پوری کیفیت نہیں معلوم کر سکتا۔ صرف نفس انسانی انھیں محسوس کر سکتا ہے اور وہ اس کی گرفت میں بھی آ سکتی ہیں۔ انھیں مقدار کے پیمانے میں ماننا محال ہے۔ ان کے صرف اوصاف بیان کئے جاسکتے ہیں۔ ان پر رائے زنی کرنے اور انھیں سمجھنے کا بس یہی ایک

طریقہ ہے۔ مختصر یہ کہ مابعد الطبیعیات فلسفہ علوم کی طرح حتمی تجربہ تک محدود نہیں اور نہ تنقید کے اصول و ضوابط کی جگر بند میں اپنے تئیں پابند کرتی ہے۔ وہ اپنی تخلیق میں دل و دماغ کی ترنگ سے بھی استفادہ کرتی ہے۔ مابعد الطبیعیات کی بدولت ذہن انسانی نے مظاہر خارجی کی تہ میں ہستی کے راز کو پہچانا۔ اسی کی بدولت انسان کو انسانی، ملکن اور محدود کے مادہ و ذات الہی کی جھلک نظر آتی ہے جو مطلق اور واجب ہے۔

فلسفہ کے اس مابعد الطبیعی تصور کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ہیں صرف اس امر کی جستجو ہے کہ عمرانیات کو اس کے روبرو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس خصوص میں پہلے ایک جگہ ہم غلط فہمی کا ازالہ کر چکے ہیں۔ عام طور پر یہ شہور ہے کہ مابعد الطبیعیات اور علم (Science) کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ کبھی دور نہیں ہو سکتے۔ اور چونکہ عمرانیات کا شمار علوم کی فہرست میں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بھی مابعد الطبیعیات کے دشمنوں کی صف میں داخل سمجھی جائے گی۔ ہیں اس سے انکار نہیں کہ بعض علمائے عمرانیات کا طرز عمل مابعد الطبیعیات کی طرف جارحانہ رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی بتلادینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ اب علمائے عمرانیات کا رویہ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ دراصل ضرورت اس کی ہے کہ علوم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہے کہ علمائے مابعد الطبیعیات کو اس امر کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ کی طرح آج مابعد الطبیعیات تمام علوم پر قابض ہونا نہیں چاہتی۔ وہ صرف اپنے حلقہ تحقیق کے گوشوں کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی حدود بس میں سے شروع ہو جاتی ہیں جہاں علوم کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ روز بروز علوم صحیحہ کے ساتھ اس کی ہمدردی بڑھتی جا رہی ہے اور روز بروز وہ ان کے نتائج کو استعمال کرنے میں پیش قدمی کا ثبوت دے رہی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم اس امر کا بھی یہاں اعادہ کریں کہ مابعد الطبیعیات ایک چوتھائی صدی سے برابر باطنی، طبیعیات، حیاتیات، اور تجربی اور تقابلی نفسیات کے نتائج کو برابر استعمال کر رہی ہے۔ بظاہر ہیں یہ شبہ کرنے کی

بابت

کوئی دہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ عمرانیات کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کرے گی۔
 ہیں تو یقین ہے کہ عنقریب وہ حیات اجتماعی کو اپنا سہارا بنائے گی۔ اس
 لئے کہ کائنات کے تمام مظاہر میں مظاہر عمرانی ہی ایسے ہیں جن کے حقائق
 سے وہ براہ راست مستفید ہو سکتی ہے۔ اخلاقی قوتوں کی کارفرمائی اگر دیکھنا
 ہو تو حیات اجتماعی کا مطالعہ کیجئے۔ یہ قوتیں صرف انسانی ذہن اور انسانی دل
 کی دنیا میں آپ کو موثر نظر آئیں گی۔ عمرانیات کا کام یہ ہے کہ ان اخلاقی
 قوتوں کے اثرات کا جائزہ لے اور مابعد الطبیعیات ان قوتوں کی اہمیت
 سے بحث کرے۔ چنانچہ عمرانیات اس کے سامنے واقعات پیش کرے گی اور
 وہ ان کی تائیدیں کرے گی۔ اول الذکر کی نظر ظاہر سے آگے نہیں بڑھتی لیکن
 آخر الذکر حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر مابعد الطبیعیات
 عمرانیات کا سہارا ڈھونڈے تو وہ نفع میں رہے گی۔ یہ یقین ہے کہ
 عنقریب ایسا ہی ہوگا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ علمائے عمرانیات
 اپنے نتائج کو محنت کے ساتھ متعین کریں اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک
 سے پیش آئیں۔

اب آخر میں ہم علمائے عمرانیات کی خدمت میں بعض ضروری باتیں پیش
 کر دینا چاہتے ہیں۔ مابعد الطبیعیات کا عمرانیات کو ہر طرح لحاظ کرنا چاہئے۔
 اس لئے کہ وہ یہ بیان کرتی ہے کہ معاشرہ میں انفرادی وجود کائنات فطرت
 زندگی اور مقدر کے متعلق کس قسم کے خیالات رائج ہیں۔ وہ ان عام تصورات
 کی بھی تصحیح کرتی ہے جو انفرادی یا اجتماعی چلن پر اپنا اثر ڈالتے ہیں کسی قوم کی
 مابعد الطبیعیات سے واقفیت حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ نے اس
 کی روح کی گہرائیوں کا کھوج لگا لیا۔ مسائل اخروی کے متعلق لوگوں کے
 جو اعتقادات ہوتے ہیں ان کا اثر اس خاص ملک اور عہد کی تاریخ پر
 پڑتا ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ فلسفیانہ خیالات کی تاریخ دراصل انسانی ذہن
 کی تاریخ سے عبارت ہے یا یوں کہئے کہ وہ یورپی انسانی زندگی کی تاریخ
 کا لب لباب ہوتی ہے۔ چنانچہ عمرانیات جیسے علم کے لئے جو بنی نوع انسان

کے ارتقائی عناصر کا استخراج پیش کرتی ہے، مابعد الطبیعیات بڑی اہمیت رکھتی ہے محقق عمرانیات کو مابعد الطبیعیات کی تاریخ کے علاوہ اس کے موجودہ عقاید سے بھی دلچسپی رکھنی ضروری ہے اس لئے کہ یہ عقاید حیات اجتماعی میں زبردست محرکات کا کام دیتے ہیں۔ مابعد الطبیعیات کی بدولت انسانی ذہن عین کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ظاہر کے ادنیٰ جلووں میں بھنس کر نہیں رہ جاتا۔ اسی کی بدولت مادہ اور قوت، زمانہ اور حرکت، جسم اور روح کے حقائق کی نقاب کشائی ہوتی ہے اور محسوسات کے علاوہ آدمی کی پہنچ وہاں تک ہو جاتی ہے جس کا ادراک صرف انسانی فکر کر سکتی ہے۔ مابعد الطبیعیات سے انسانی عقل کو مجسمہ، مادہ اور غیر محسوس تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر ہم اسے تخلیقی قوت کے اس سرچشمہ سے تعبیر کر سکتے ہیں جو ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس کا فیض ہمارے لئے اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کے لئے ہے جو مستقبل میں تہذیب و تمدن کی علمبردار ہوں گی۔

اگر آپ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو عمرانیات اور مابعد الطبیعیات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ دونوں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ دونوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ہمارے خیال میں افسانہ تحقیق میں بڑی وسعت و گنجائش ہے بشرطیکہ کام کرنے والوں کی نیتیں ٹھیک ہوں۔

— — — — —

صحنامہ

مبادی عمرانیات (رینے ورم)

صحیح	غلط	صحیح	غلط	صحیح	غلط	صحیح	غلط
۴	۳	۲	۱	۴	۳	۲	۱
انتیازات	انتیازیات	۵	۷۴	خاکر کے فرائض	خاکر کے فرائض	۱۹	۳۴
اسی طرح	اس طرح	۱۳	"	اسی جبر کا اثر	اسی جبر کا اثر	۱۳	۳۷
تماشا	تماشاہ	۶	۸۹	وجود سے	قدرو قیمت سے	۱۶	۴۴
ان کی بنا پر	ان کی بنا پر	۲۲	۱۰۴	عمر زیادہ سے زیادہ	عمر زیادہ سے	۲۳	۴۶
مملکت	ملاکت	۱۱	۱۲۲	زیادہ ہوئی	بہت ہوئی		
جستہ جستہ	جستہ جستہ	۲۱	"	پر لو ہوئے	پر لو ہوئے	۲۳	۴۹
پیشتر	پیشتر	۱۰	۱۲۹	اور ان انسانی ارادوں	ان انسانی ارادوں	۱۳	۵۶
ذکر کر چکے	ذکر کر چکے	۱۷	۱۳۵	اور اور مختلف	اور مختلف		
اُتروئی	اُتروئی	۲۱	۱۶۶	مقامات میں	مقامات میں	۱۴	۱۳
اوراء	اوراء	۹	۱۶۷	باتھ کی نگلیوں	باتھ کی انگلیوں	۸	۵۷
آہیوالی نسلوں	آہیوالی نسلوں	۱۲	۵	مترشح	ترشح	۱۵	۶۳

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

گنجینہ جامعہ

۱۔ اگر کسی نے اس کتاب کو پڑھا تو اس کا دل بے شک
 ۲۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۳۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۴۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۵۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۶۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۷۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۸۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۹۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک
 ۱۰۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس کا دل بے شک

